عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

July 1939

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے قیمت ۸ محصولڈاک ۱ر

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱/ر

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جس نے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۱ر

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی)۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کررہے ہیں قیمت ۱/ علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّب
محمد ظہیر الدین صدیقی بی۔ایس سی

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ آٹھ آنہ

جلد (۲) شمار ۳
جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۸ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

فہرستِ مضامین

۱۔ سادگی و پرکاری	حضرت علامہ ڈاکٹر اقبال رح	۳
۲۔ لمعات	ادارہ	۴-۸
۳۔ حقائق و عِبر	ادارہ	۹-۲۲
۴۔ سامانِ عشق	اسد ملتانی	۲۳
۵۔ رُباعی	حضرت اخگر مرادآبادی	۲۴
۶۔ سوشلزم اور اسلام	ایک مسلمان	۲۵-۱۰۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فی ما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایھا الذین امنوا

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم	اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا
بات مانو اللہ و رسول کی جب تمہیں اس کام کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو	اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا	جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !
علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار	لا اسلام الا بالجماعۃ
(فرمان رسول)	(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ   باہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

سادگی و پرکاری

در صد فتنہ را بر خود کشادی
دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

نگہ دارد برہمن کارِ خود را
نمیگوید بہ کس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

اقبالؒ

لمعات

لکھنؤ کے حادثۂ الم انگیز و جگر سوز کے متعلق ہم نے ایک سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ فریقین کی ضد سے ۔ جسے وہ اپنی زبان میں "سودائے جنت طلبی" سے تعبیر کرتے ہیں ۔ معاملہ اس حد تک جا پہنچا ہے کہ وہ اب پند و نصائح سے سلجھایا نہیں جا سکتا ۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک صاحبِ اقتدار مرکز ہوتا جو قرآنِ کریم کے متعین فرمودہ مسلک کے مطابق اس تنازعہ کا فیصلہ کرتا ۔ لیکن ہندوستان میں ہنوز مسلمانوں کے سامنے جماعتی زندگی کا تخیل ہی پیدا نہیں ہوا ۔ مرکز اور مرکز کی قوت کہاں سے آئے ۔

دہن کا نام کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

البتہ اس اسلامی زندگی کا ایک دھندلا سا نقشہ ہمیں اس تنظیم میں دکھائی دیتا ہے جسے تحریک خاکساران کہتے ہیں ۔ ہماری نگاہیں چاروں طرف سے نا اُمید ہو کر ان ہی کی طرف اٹھتی تھیں ۔ بارے الحمد للہ کہ اُنہوں نے ہمیں مایوس نہیں ہونے دیا ۔ اور علامہ مشرقی نے اعلان کر دیا کہ اگر ۳۰ جون تک فریقین اپنی ضد سے باز نہ آئے تو وہ آٹھ سو جانباز اور دو ہزار خاکساروں کی جمعیت کے ذریعے جھگڑا چکانے کا بندوبست کریں گے ۔ علامہ مشرقی کے لائحۂ عمل کی تفصیلات باہر نہیں آئیں لیکن وہ جو کچھ بھی ہوں اُمید ہے کہ ان کا یہ اقدام اس مسلک کے مطابق ہو گا جس کا حکم قرآنِ کریم نے دیا ہے سورۂ حجرات میں ہے ۔ وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم دگر برسرِ پیکار ہوں تو اُن میں صلح کرا دو ۔ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۔ لیکن اگر (باوجود صلح کے) ایک جماعت دوسری کے خلاف سرکشی پر اُتر آئے تو پھر جو جماعت سرکشی کرے تم اس کے خلاف صف آرائی کرو ۔ حتّٰی کہ وہ جھک کر خدا کے حکم کے سامنے گردنِ تسلیم خم کر دے ۔ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

وَاَقْسِطُوْ ۔ سو جب وہ یوں جھک کر آمادۂ صلح ہو جائے تو ان میں عدل و انصاف سے صلح کرادو۔ ہم علامہ مشرقی کی خدمت میں اُن کے اس مستحسن اقدام پر ملتِ اسلامیہ کی طرف سے دلی ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ کی نصرت ورحمت ان کے ساتھ ہو کہ انہوں نے اس دور میں جب کہ مسلمانوں کی نگاہوں سے مذہب کا یہ تخیل ہی گم ہو چکا تھا پھر سے اس بھولی ہوئی داستان کی یاد تازہ کرادی کہ جس سے قوموں کے عروقِ مردہ میں خون زندگی دوڑ جائے اور ان کی نبضِ حیات میں تموّج پیدا ہو جائے۔ اسلام تو دنیا میں سکھانے ہی یہ آیا تھا

مومناں را تیغ با قرآں بس است

اس لیے کہ جب تک "شمشیر" اور قرآن ہم دوش نہ چلیں مسلمانوں کے اعمالِ صالحہ وہ صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے جسے قرآن کریم استخلاف فی الارض کہتا ہے۔ قوانین الٰہیہ کی محافظ شمشیر اور شمشیر کو حدودِ الٰہیہ کے اندر محصور رکھنے والا قرآن۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　　کائنات زندگی را محور اند

آپ اشاعت زیر نظر میں عنوان "حقائق وعبر" کے ماتحت ایک مختصر سا شذرہ تحریک خاکساران کے متعلق ملاحظہ فرمائیں گے جس میں حادثۂ اکوڑہ کا ضمناً ذکر آگیا ہے وہ حصہ پریس میں جا چکا تھا کہ ۲۳ رجون کے الاصلاح میں اس سانحۂ ہوش ربا کی تفصیلات نظر سے گذریں اللہ اکبر! ذرا تصور میں لایئے اس زہرہ گداز نقشے کو کہ بستی سے باہر کھلے میدان میں مسلمانوں کی ایک جماعت مصروفِ نماز ہو اور پیچھے سے مسلمانوں ہی کی ایک دوسری جماعت ان پر لاٹھیوں، تبروں اور کلہاڑیوں سے حملہ کر دے اور یوں سربسجود پیشانیاں خون سے رنگ دی جائیں اور خدا کے حضور میں جھکی ہوئی گردنوں کی ہڈیاں توڑی جائیں۔ چوں کہ یہ معاملہ اس وقت زیر تفتیش ہے اس لیے ہم سر دست اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ لیکن اتنا تو ظاہر ہے کہ عوام کو اس قسم کے وحشت انگیز مظالم پر آمادہ کرنے کے موجب وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ہم پہلے بھی لکھ چکے

ہیں کہ ان کا ذریعۂ معاش ہی یہ ہے کہ وہ لیڈری کے بہروپ میں دشمنانِ ملت کے آلۂ کار بن کر ہر اس مقام پر فتنہ انگیزی شروع کر دیں جہاں وہ دیکھیں کہ مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو کر منظم ہو رہا ہے۔ جب تک اس قسم کے بے کار "جنت فروشوں" کا خاطر خواہ بندوبست نہیں ہوتا۔ ملت کو فلاح و سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور ان کے بندوبست کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جماعتی تشکیل کے بعد مرکزِ ملت کو اتنا مضبوط کر دیجئے کہ وہاں کی سند کے بغیر کوئی شخص "رہبرِ ملت" نہ بن سکے۔ ورنہ جب تک یہ حالت ہے کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ وفا گئی

اس وقت تک شیوۂ اہلِ وفا کی آبرو کا حال معلوم۔

"حقائق و عبر" میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے اس خطبہ پر ہمارا تبصرہ بھی آپ کی نظر سے گزرے گا جو انہوں نے جمعیت علماء (صوبۂ بنگال) کے اجلاس میں بہ حیثیت صدر ارشاد فرمایا ہے۔ اس تبصرہ سے آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی کہ مولانا صاحب کے ارشادات سے کس طرح وہ "وحشت" ابھر ابھر کر نمایاں ہو رہی ہے جو بقول اُن کے وطن کی جُدائی کے احساس سے ان کے قلب و دماغ پر مسلط ہو چکی تھی، اس خطبہ کے متعلق قومیت پرست اخبارات میں سے اس وقت تک صرف معاصر مدینہ کا تبصرہ ہماری نظر سے گزرا ہے جو بجائے خویش، پریشانیٔ فکر و نظر کا مرقع اور جنبہ داری کا آئینہ دار ہے۔ مولانا صاحب نے تحریک قومیت پرستی کے متعلق فرمایا ہے کہ کانگریس کو چاہیئے کہ اسے یورپ کی نیشنلزم کے انداز پر ترقی دے۔ چوں کہ یہ مشورہ اس متحدہ قومیت کی تائید میں ہے جس کے علمبردار ہمارے قومیت پرست حضرات ہیں اس لیے اس حصہ کے متعلق معاصر مدینہ کا ارشاد ہے کہ یہ مولانا صاحب کی "وسعتِ نظر، وسعتِ معلومات، وسعتِ مطالعہ، وسعتِ تجربہ۔ بیباکی اور راست بازی، بے خوفی و جرأت" کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا صاحب نے رومن رسم الخط

کی ترویج۔ ہیٹ اور نیکر کا استعمال اور بوٹ سمیت نماز پڑھنے کی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ ان کے متعلق ہمارے معاصر کا ارشاد ہے کہ "ہمیں توقع ہے کہ جب مولانا کو ذرا سکون میسر آئے گا تو وہ خود ان چیزوں کو غیر ضروری سمجھیں گے"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ خطبہ کا جو حصّہ اپنے نظریہ کے مطابق ہے وہ عقل و ہوش کے معراجِ کمال کا مظہر لیکن جس حصّہ سے اختلاف ہو وہ وحشت اور سراسیمگی کا نتیجہ! ظاہر ہے کہ مولانا صاحب نے جو کچھ اپنے خطبہ میں فرمایا ہے ایک ہی وقت میں ارشاد فرمایا ہے اس لیے اگر وہ عقل و خرد۔ فراست و بصیرت کا مظہر ہے تو سب کا سب ہے اور اگر اس پر وحشت و پریشانیٔ خیالات کا اثر ہے تو سب پر ہے۔ اس تقسیم کے کیا معنی کہ ایک حصّہ بصیرت و حکمت سے مملو ہے اور دوسرا حصّہ عدم سکون کا نتیجہ۔

ہم اپنے مؤقر معاصر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اگر وہ متحدہ قومیّت کے تصور سے خالی الذہن ہو کر اس خطبے کا مطالعہ فرمائیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مولانا صاحب کے خطبے کا پہلا حصّہ بھی ویسا ہی عدم سکون کا نتیجہ ہے جیسا کہ دوسرا حصّہ۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی قلب اور ایک ہی دماغ ہے فرق صرف آپکی نگاہ کا ہے۔

قارئین طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک عرصہ سے پیہم یہ اصرار چلا آتا تھا کہ سوشلزم کے متعلق ضرور کچھ لکھا جائے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا سیلاب بلا انگیز ہے جس میں ہماری قوم کے نوجوان کشاں کشاں بہے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر اشاعت میں "سوشلزم اور اسلام" کے عنوان پر ایک بسوط مضمون شائع ہو رہا ہے۔ چوں کہ یہ نہایت ضروری تھا کہ سوشلزم کے مالہٗ و ماعلیہ کے متعلق واضح طور پر لکھا جائے اور اس کے بعد یہ بتایا جائے کہ اسلام کی کسوٹی پر اس کی حقیقت کیا کھلتی ہے اس لیے اس مضمون کا طویل ہو جانا ناگزیر تھا۔ ہمیں تجربہ نے بتایا ہے کہ ایک ماہواری رسالے میں کسی مضمون کو بالاقساط شائع کرنا اس کی اہمیّت کو کھو دینا اور اس کی افادی حیثیت کو ضائع کر دینا ہے اس لیے ہم ایسے اہم مضامین کو ایک ہی قسط میں شائع کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر چند اس سے

رسالہ کے تنوع میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن تنوع مقصود بالذات نہیں۔ اصلی مقصد تو کسی چیز کو بالوضاحت سامنے لانا ہے مضمون مذکورہ صدر کے مطالعہ کے بعد آپ یقیناً ہم سے متفق ہونگے کہ یہ اپنے مقصد میں نہایت کامیاب ہے۔ اسکی عام اشاعت کے پیش نظر ہم اسے ایک پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر رہے ہیں

پمفلٹوں کی عام تقسیم کے لیے قارئین طلوع اسلام میں سے بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ صاحبِ استطاعت حضرات کچھ کاپیوں کی لاگت ادا کر دیا کریں جو ادارہ سے مستحق حلقہ میں مفت تقسیم کر دی جایا کریں۔ چنانچہ اس اسکیم پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور اس مہینے میں جو عطیات اس مد میں موصول ہوئے ہیں انہیں متعین کردہ پمفلٹوں کی لاگت پر صرف کیا جا رہا ہے اگر آپ بھی اس تجویز سے متفق ہوں تو اس میں تعاون فرمایئے غالباً آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ ادارہ طلوع اسلام کے شائع کردہ پمفلٹوں نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مسلمان نوجوانوں کے فکر و نظر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے

سابقہ اشاعت میں ہم نے دو پمفلٹوں کے اشتہار میں جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے اسم گرامی کے ساتھ "ہر دل عزیز متکلم اسلام مولانا" کے برمحل القابات کا اضافہ کر دیا تھا۔ جناب پرویز صاحب اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نہ ہر دلعزیز ہوں۔ نہ متکلم اسلام اور نہ مولانا۔ اس لیے براہِ کرم مجھے ان نوازش ہائے بے جا سے معاف ہی رکھیے کہ یہ چیزیں اکثر فریبِ نفس کا باعث ہو کر انسان کی ہلاکت کا موجب بن جاتی ہیں" ہم نے یہ القاب محض اس لیے لکھ دیئے تھے کہ ہم پرویز صاحب کو ان کا اہل سمجھتے تھے (اور سمجھتے ہیں) لیکن الامر فوق الادب۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

بڑی مشکل ہے! جن احباب کو تجدید خریداری کا کارڈ بطور یاد دہانی بھیجا جاتا ہے وہ اسکے جواب میں تساہل برتتے ہیں اور جب عدمِ جواب کی صورت میں مجبوراً رسالہ بند کر دیا جاتا ہے تو شکایت کی بھرمار شروع کر دیتے ہیں، ہم اپنے ان تغافل شعار کرم فرماؤں کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ یاد دہانی کے کارڈ پر ایک سطر لکھ دینا شکایت نامہ کے دو تین صفحات سے یقیناً زیادہ آسان بھی ہے اور زیادہ مفید بھی۔ ذرا ایک مرتبہ تجربہ کر کے تو دیکھیے۔

حقائق و عبر

مولانائے سندھی

جب سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مراجعت فرمائے ہند ہوئے ہیں ہم اُن کی تقریروں اور تحریروں کا بامعانِ نظر مطالعہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ جس زمانہ میں اُن کی آمد آمد کی تیاری تھی اُن کی اصابتِ رائے۔ بلندیِ فکر و نظر۔ تدبر فی الامور۔ سیاست دانی اور قرآن فہمی کے متعلق عام چرچے ہو رہے تھے۔ لیکن ہندوستان میں تشریف لانے کے بعد مولانا صاحب نے وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے انھوں نے ہمارے دل پر کم از کم اُن کی بالغ نظری اور سیاست دانی کے متعلق کچھ اچھے نقوش نہیں چھوڑے۔ بایں ہمہ ہم انتظار میں تھے کہ مولانا صاحب یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد کہیں جامع انداز سے اپنے خیالات پیش کریں تو اُن سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچا جائے۔ بارے الحمد کہ اس باب میں مولانا صاحب نے ہمیں زیادہ زحمتِ انتظار سے بچالیا اور اجلاس جمعیتِ علمائے ہند (صوبہ بنگال) کے خطبۂ صدارت نے آپ کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ یہ خطبہ جس پریشانیِ فکر و نظر کا آئینہ دار ہے اس سے قرآن کریم کی یہ حقیقتِ بالغہ واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ مَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ۔ (جو زیادہ عمر رسیدہ ہو جاتا ہے اُس کی طبعی حالت بالکل الٹی ہو جاتی ہے)۔

اِس خطبہ کی تمہید میں مولانا صاحب فرماتے ہیں:۔

"اَب کہ مجھے وطن آنے کی اجازت ملی ہے آہستہ آہستہ میرے دماغ سے وحشت دور ہو رہی ہے۔" (مدینہ، ۱۷ جون ۱۹۳۹ء)

عام حالات میں وطن کی محبت اور اُس کی یاد مستحسن جذبہ سہی۔ لیکن ایک مومن مجاہد حبب اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے وطن چھوڑتا ہے تو وطن کی یاد میں اِس قسم کے جذبات کبھی مستحقِ تبریک قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ ہجرت فی سبیل اللہ اور حرمِ پاک کی زندگی! اس پر تو ہندوستان جیسی غلام سرزمین کی لاکھوں آسائشیں قربان ہونی چاہئیں۔ پھر وحشت کیسی؟ مومن کا تو ایمان یہ ہے کہ

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

مولانا صاحب کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی یہ ہجرت اور قیامِ حرم مقدس "عصمتِ بی بی از بیچارگی" تھی۔ بطیبِ خاطر نہ تھی۔

اِسکے بعد مولانا صاحب نے جو سیاسی نصب العین ملک کے سامنے پیش کیا ہے اُسے دیکھکر تو ہمیں مولانا صاحب کی فراستِ قرآنی کے فقدان اور سیاستِ اسلامی سے عدمِ واقفیت پر بے حد تعجب ہوا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"اگر میرا وطن اِس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اِسوقت دُنیا پر چھا گیا ہے اور روز بروز چھاتا چلا جا رہا ہے تو اُسے یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے۔.....

ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہدِ قدیم جو ہندو تہذیب کہلاتا ہے اور عہدِ جدید جسے اسلامی تہذیب سمجھا جاتا ہے دونوں مذہبی سکول ہیں لیکن آجکل کا یورپین اسکول مذہب سے قطعی نابلد ہے۔ اس کا مدار فقط سائنس اور فلسفہ پر ہے۔ اِس لئے ہمارے وطن میں اگر اِس انقلاب کو سمجھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوئی تو سراسر نقصان ہی نقصان ہمارے حصّے میں آئیگا۔"

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک صحیح اسلامی سیاست یہ ہے کہ ملک میں یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے یا تو مولانا صاحب کو اس کا علم نہیں کہ یورپین نیشنلزم کے اُصول و مبانی کیا ہیں اور یا پھر معاف بفرمائید۔ وہ قرآنی نظریہ اجتماعیت سے قطعی نابلد ہیں۔ اس لئے کہ یہ دونوں اُصول ایکدوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یورپین نیشنلزم کی بُنیاد مولانا حسین احمد صاحب کے الفاظ میں اِس اُصول پر ہے کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ یورپ میں افراد کے ایک قوم بننے کے لئے وجہِ جامعیت جغرافیائی حدود یا نسلی امتیازات ہیں۔ برعکس اس کے اِسلامی جماعت کے لئے وجہ جامعیت صرف ایمان و تقویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیت پرستی ایک ایسی "کانِ نمک" ہے کہ اس میں جو کوئی بھی پہنچ جائے "نمک" بن جاتا ہے۔ افسوس کہ مولانا صاحب کی فراستِ قرآنی کے متعلق ہمارے اندازے کس قدر غلط ثابت ہوئے۔

پھر فرماتے ہیں :-

"اِس لئے میں سفارش کرتا ہوں کہ نیشنل کانگریس کے کرتے دھرتے یورپین نیشنلزم کو رواج دینا اپنا نصب العین بنائیں اور فقط اقتصادی ترقی کو آزادی کی بُنیاد قرار دیں۔"

یعنی یورپین نیشنلزم اور اُس کی سوشلزم۔ یہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی نصب العین۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا الیہ راجعون! ۔ نہ کہیں خدا کا نام۔ نہ رسولؐ کا۔ نہ قوانینِ الٰہیہ کا ذکر نہ خدا کی حکومت کا۔ نہ اپنی مرکزیت کا احساس نہ اجتماعیت کا۔ جغرافیائی حدود کی بِنا پر قومیت اور روٹی کے سوال کا حَل۔ یہ ہے مولانا صاحب کے نزدیک تحریکِ آزادی کا عُروۃ الوثقیٰ۔

سیاست کے متعلق تو آپ نے مولانا صاحب کی بلند نگہی مُلاحظہ فرمالی۔ اب فلسفۂ اسلام کے متعلق بھی آپ کے ارشادات سُن لیجیئے۔ آپ کی تجویز یہ ہے کہ جمعیتِ علمائے ہند کو دو شعبوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اُن میں سے ایک شعبہ کے متعلق فرماتے ہیں:-

"جمعیت العلماء کے دوسرے سکشن کو اسلامی فلاسفی کا محافظ ہونا چاہئے۔ یہ اسلامی فلاسفی دراصل وہی ہندو فلاسفی ہے جسے مُسلم صوفیائے کرام نے ہندوستان میں تکمیل کے درجہ تک پہنچایا ہے"

مولنٰا صاحب جامعۂ ملیہ میں اِسی قسم کے "اسلامی فلسفہ" کا ایک مدرسہ کھولنا چاہتے ہیں جہاں کے فارغ التحصیل مُسلم نیشنلسٹ ۔

"ہندو فلاسفروں سے متحد الخیال ہو کر یورپین انقلابِ معاشی میں ہندوستان کو بہت آگے لیجائینگے۔"

یعنی اسلام کا نہ کوئی اپنا فلسفۂ زندگی ہے نہ معاشی نظام۔ فلسفہ میں ہندوؤں سے متحد الخیال ہونا چاہیئے اور نظامِ معاشی کے لئے یورپ کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اِس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے آپ فرماتے ہیں:-

"جمعیت العلماء کا وہ سکشن جو حکمت و فلسفہ کے لئے خاص ہو گا میں اُس کے ہر ایک ممبر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر ہو جائے۔ (اور)

(ii) انڈین نیشنل کانگریس کو تمام سیاسیاتِ ہند کا مرکز بنا دیا جائے (لیکن یہ یاد رہے کہ)

(iii) مذہبی مراسم کو نیشنل تحریک کا جزو بنانا۔ خواہ کیسی نیک نیتی سے ہو ملک کو تباہی سے نجات نہیں دے گا۔"

اِس کے بعد آپ نے اس پروگرام کی وضاحت کی ہے جسے وہ تحریکِ انقلاب کی تمہید کے طور پر نمونۃً

سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مثلاً

(۱) سندھی زبان (جو آجکل عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے) کو رومن رسم الخط میں لکھا جائے

(۲) مسلمان گھٹنوں سے نیچے تک کی نیکر اور ہیٹ پہنیں اور ننگے سر نماز پڑھ لیا کریں۔

(۳) نماز بوٹ سمیت پڑھ لی جایا کرے۔

یہ ہے نمونہ اُن افکارِ عالیہ کا جنھیں اپنے دماغ میں لئے ہوئے مولانا صاحب ہندوستان میں ایک اسلامی انقلاب پیدا کرنے اور کانگریس میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے فلسفہ کو رائج کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ ہمیں مولانا صاحب کے اخلاص اور جوشِ عمل میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اور اسی وجہ سے ہمارے دل میں اُن کی عزت بھی ہے لیکن جوشِ عمل سے ایک شخص ایک اچھا سپاہی بن سکتا ہے (بشرطیکہ اُس میں جذبۂ اطاعت بھی موجود ہو) سیاسی قیادت کے لئے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم ہر شخص کو اُس کے صحیح مقام پر نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ سے ہمیں بار بار ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں ہمارا خیال ہے کہ مولانا صاحب کو اپنی سیاسی بصیرت اور صحیح مقام کی شناخت میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس میں اُن کے عقیدتمندوں کا وہ حلقہ زیادہ ذمہ دار ہے جس نے یہ سمجھکر کہ مولانا صاحب نے ہندوستان پہنچکر جس مقام کو اپنا مستقر بنالیا وہ تمام سیاسیاتِ اسلامیہ کا قبلۂ مقصود بن جائیگا، ان کی ذاتِ گرامی کو بیجا اہمیت دیدی۔ اور اس بات کا اندازہ نہیں لگایا کہ اس سے آخر کار کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ قوم کی انھی غلط بخشیوں کا نتیجہ ہے کہ ہندو جب ہمارے اتنے اتنے عظیم المرتبت اکابرِ ملت کی اس قسم کی پریشان خیالی دیکھتے ہیں تو اُن کے دل میں اپنے متعلق ایک قومی جذبۂ تفوق اور اسکے برعکس مسلمانوں کو اپنے متعلق احساسِ مرعوبیت (Inferiority Complex,) پیدا ہو جاتا ہے۔

مولانا صاحب نے بنارس میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ کو ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ

"ملک میں ایک جدید تعمیری پروگرام کا ہونا ضروری ہے جو گاندھی جی کے زیرِ قیادت گورنمنٹ کے ساتھ تعاون پر مبنی ہو۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۸ ۶/۳۹)

ایکطرف مولانا صاحب کے دعاوی انقلاب کو مدنظر رکھئے اور دوسری طرف اس تعمیری پروگرام کو اور اس کے بعد مولانا صاحب کی سیاسی بصیرت کے متعلق خود ہی فیصلہ فرمالیجئے۔

الحمدللہ علیٰ ذالک کہ ہمیں قرآن کریم کی تعلیم نے پہلے ہی شخصیت پرستی سے دور رکھا ہے۔ ورنہ ایسے وقت میں انسان جس مشکل میں پھنس جاتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ہماری رائے میں تو مولانا صاحب (اور خود ملتِ اسلامیہ) کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ کسی دینیاتی درسگاہ میں فقہ و حدیث کے درس میں مشغول رہیں ہر کسے را بہر کارے ساختند

۲۔ **خاکساران** ہم نے آجتک تحریک خاکساران کے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ جو تحریک خود اپنے عمل کی اپنی دلیل آپ بن رہی ہو اس کے متعلق کچھ لکھنے کی کیا حاجت! لیکن اب بعض ایسے واقعات ہمارے سامنے آرہے ہیں جن کے پیش نظر ہم سمجھتے ہیں کہ

اگر خاموش نشینم گناہ است

۲۶ مئی کے اخبار الاصلاح میں حسب ذیل واقعہ درج ہے :-

"ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم سرحد کی آمد پر سرخپوشوں کا ایک دستہ بھی (ہری پور ہزارہ میں) آیا ہوا ہے۔ پرسوں رات سرخپوش روٹی کھانے کے لئے عزیز محمد ہوٹل والے کی دکان پر آئے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں معلوم ہوا کہ مالک ہوٹل خاکسار ہے۔ تو ایک کانگریسی ممبر اسمبلی تمام سرخپوشوں کو باہر نکال کر لے گیا اور دوسرے ہوٹل میں جا بیٹھے۔ ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب ایک دوسرے خاکسار نے اس دکاندار کو فوجی سلام کیا۔ وہاں سے اٹھ کر جب وہ بازار آئے تو ایک ہندو سے پانی مانگا۔ جب وہ پانی دینے لگا تو عزیز محمد نے جس کی دکان کو پہلے اٹھ کر چلے گئے تھے کہا کہ یہ بھی خاکسار ہے۔ تو جھجک کر پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے ساتھی نے کہا نہیں یہ تو ہندو ہے اور ہمارا بھائی ہے۔ گلاس لے کر پانی پی لیا۔"

سن لیا آپ نے! ہندو ان کا اپنا بھائی ہے اور خاکسار مسلمان اچھوت ہے۔ پھر ۱۳ جون کے

نیشنل کال میں ہے کہ موضع اکوڑہ (پشاور) کے ایک مولوی صاحب نے خاکساروں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اور انھیں فریضۂ نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد میں آنے سے روک دیا۔ جس کی وجہ سے وہاں باہمی فساد ہوگیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ خاکسار کون ہیں جن کے ہاتھ کا کھانا حرام سمجھا جاتا ہے (اور اُن کے مقابلہ میں ایک ہندو کے ہاتھ سے لے کر پانی پی لیا جاتا ہے) اور جنھیں نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دی جاتی! یہ وہ ہیں جو اللہ پر۔ اُس کے رسولوں پر۔ اُس کی کتابوں پر۔ ملائکہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نبی اکرم کو خاتم النبیین اور کتاب اللہ کو خدا کا آخری اور مکمل پیغام سمجھتے ہیں۔ خدمتِ خلق جن کا شیوہ اور سپاہیانہ زندگی جن کا مسلک ہے۔ جرم اُن کا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض قرار دیتے ہیں کہ قرآن کریم انھیں ایسا سمجھنے پر مجبور کرتا ہے عسکری نظام کو مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے لئے لاینفک خیال کرتے ہیں کہ نبی اکرم کا اسوۂ حسنہ انھیں ایسا خیال کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اجتماعیت اور اطاعتِ امیر کے جذبۂ صادقہ کو روحِ اسلامی سمجھتے ہیں کہ اُن کے نزدیک آثارِ صحابہ ایسا سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں "خدا پر توکل۔ ہر ایک سے عمدہ سلوک۔ آپس میں محبت۔ سادگیِ لباس۔ ماں باپ کی فرمانبرداری۔ عورتوں سے شفقت۔ کامل دیانتداری فتح پر مکمل یقین۔ زمین پر قبضہ کی خواہش۔ خدا کی نعمتوں کا انتظار۔ اللہ پر پورا ایمان۔ روزِ قیامت پر پورا یقین" اپنا مسلک قرار دیتے ہیں (مضمون علامہ مشرقی۔ الاصلاح ۹ رجون ۱۹۳۹ء)۔ فرقہ پرستی۔ گروہ سازی۔ جماعت بندی۔ تشتت۔ افتراق۔ لامرکزیت اُن کے نزدیک گناہِ عظیم اور اتحاد و یگانگت اور وحدت فی الخیال والعمل صحیح اسلامی تعلیم ہے۔ عزت و وقار۔ سرفرازی اور سربلندی آزادی اور حکومت کی زندگی اُن کے خیال میں صحیح اسلامی زندگی اور ذلت و رسوائی مفلسی اور غریبی بے کسی اور بے بسی۔ بھوک اور خوف کی زندگی غیر اسلامی زندگی ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ مولوی صاحبان کے نزدیک یہ لوگ گردن زدنی اور سوختنی کیوں ہیں؟

ہمیں تسلیم ہے کہ اس تحریک میں ہنوز بعض خامیاں بھی ہیں اور اصلاح کی گنجائش بھی۔ لیکن اس تحریک کا بانی نہ (معاذ اللہ) رسول ہے نہ مدعیِ معصومیت۔ وہ ایک انسان ہے جس سے غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں اور سہو اور فروگزاشتیں بھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو نصب العین اس تحریک کے سامنے ہے اور اس کے حصول کے لئے جو ذریعہ اختیار کیا گیا ہے کیا وہ واقعی ایسا ہے کہ اس تحریک میں شامل ہونے والوں پر کفر کے فتوے لگا کر بزعم خویش

انھیں جہنم رسید کر دیا جائے۔ فیھا آیاتٌ لقومٍ یعقلون۔

ہم علامہ مشرقی اور اُن کے جانباز سپاہیوں کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ ان مخالفتوں کے ہجوم میں اُن کا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

البتہ اتنا ضرور ہے کہ انھیں سرگرمیٔ عمل کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح نفوس کی طرف سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے ہم علامہ مشرقی کی خدمت میں باادب درخواست کرینگے کہ وہ خاکساروں کو پابندیٔ صوم و صلوٰۃ و دیگر احکامِ خداوندی کی زیادہ تاکید کریں اور اپنی تنظیم جیوش میں الٰہی راستوں سے پختگی پیدا کریں۔ اس کے بعد وہ دیکھینگے کہ اس آئنی جدوجہد کے بعد جس میں آج درد ملت رکھنے والے مسلمان ساعی ہیں اور جس کی اس وقت ضرورت بھی مسلّم ہے ہندوستان کا مستقبل انشآء اللہ الٰہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ باقی رہے مولوی صاحبان۔ سو وہ قابلِ عفو ہیں کہ

قوم کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے   اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

خاکساروں کے ضمن میں ہمیں ایک اور بات بھی یاد آگئی۔ جس کا تذکرہ ہمارے لئے از حد جگر خراش ہے۔ ہمارے دِل میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا بیحد احترام ہے لیکن ہمیں یہ دیکھکر رنج ہوا کہ انھوں نے مسٹر جناح کو لکھا ہے کہ

"مسلم لیگ خاکساروں کی مخالفت کا اعلان کر دے۔ کیونکہ یہ فرقہ مذہبی حیثیت سے اسلام سے خارج ہے۔ اگر آپ نے ایسا اقدام نہ کیا تو میں مجبور ہونگا کہ مسلم لیگ کی مخالفت شروع کر دوں۔"   (مدینہ ۱۷ ۶/۳۹)

اگر یہ خبر صحیح ہے تو نہایت قابلِ تاسف ہے۔ مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ "خاکسار" مذہبی حیثیت سے اسلام سے خارج ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ اگر خاکسار "مذہبی حیثیت سے" اسلام سے خارج ہیں تو وہ کون سی حیثیت ہے جس کی رو سے وہ اسلام کے دائرے کے اندر ہیں! پھر یہ امر موجب حیرت ہے کہ اگر خاکساروں کی کوئی روش مولانا صاحب کے نزدیک غلط ہے تو لیگ پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ سب سے زیادہ تعجب مولانا کے اس ارشاد پر

ہے کہ اگر لیگ نے خاکساروں کی مخالفت نہ کی تو وہ لیگ کی مخالفت شروع کر دینگے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ کسی جماعت کی مخالفت یا موافقت کسی اصول کے ماتحت ہونی چاہئے۔ نہ یہ کہ جب تک کوئی جماعت آپ کے حسب منشاء کام کرے آپ اُس کی موافقت کریں اور جونہی کوئی بات آپ کی رائے کے خلاف ہو آپ اُسکی مخالفت شروع کر دیں۔ اِس طرح تو دنیا میں کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر لیگ خاکساروں کی مخالفت نہ کریگی تو وہ اس کی مخالفت شروع کر دینگے۔ کل کو کوئی دوسرے صاحب کہدینگے کہ اگر لیگ خاکساروں کی مخالفت کریگی تو میں لیگ کی مخالفت شروع کر دونگا۔ کہئے! لیگ کس کی تائید کرے اور کس کی تردید۔ جماعتی زندگی کی صحیح روش تو یہ ہے کہ اہل الرائے حضرات کی مجلسِ شوریٰ ہو۔ اور ہر شخص کو حق حاصل ہو کہ اِس مجلس منتخبہ کے سامنے اپنے خیالات اور آراء پیش کر دے۔ پھر جو فیصلہ وہاں سے صادر ہو ہر شخص پر اُس کی اطاعت واجب ہو جائے۔ قرنِ اولیٰ کی تاریخ میں آپ کو اس امر کی سیکڑوں مثالیں ملینگی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب فتنۂ ارتداد کے استیصال کا ارادہ فرمایا ہے تو صحابۂ کبارؓ میں سے اکثر کی رائے اِس مُہم کے خلاف تھی۔ لیکن جب فیصلہ ہو گیا کہ یہ مہم سر کی جائے گی تو وہ تمام حضراتؓ جن کی رائے اس کے خلاف تھی اِس لشکر میں شامل تھے۔ اگر وہ بھی یہی کہدیتے کہ اگر ہماری رائے کے خلاف فیصلہ ہوا تو ہم جماعت کی مخالفت شروع کر دینگے تو نتیجہ ظاہر ہے! ہم نے یہ مثال صحیح جماعتی زندگی کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے بیان کی ہے۔ خدا کرے کہ یہ خبر غلط ہو۔ اور مولانا صاحب نے ایسا نہ فرمایا ہو۔ کہ یہ طرزِ عمل تو کچھ اُن کے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔

۳۔ شکستِ پندار کانگریس کے اجلاس پری پوری میں ہزارہا بت پرستوں نے سیکڑوں خدا پرستوں کی موجودگی میں ایک انسان کے متعلق منزّہ عن الخطاء ہونے کا ریزولیشن پاس کر کے بزعم خویش اُسے خدائی صفات سے متصف کر دیا۔ لیکن فطرت کی داروگیر ملاحظہ فرمایئے کہ آئے دن اِس مصنوعی "خدا" سے اُسکی لغزشوں اور خطاؤں کا اعتراف کراتی رہتی ہے تاکہ غلط بین عقیدتمندوں پر واضح کر دے کہ کوئی شخص تمھارے بنانے سے منزّہ عن الخطاء نہیں بن سکتا۔ ۱۰ر جون کے ہریجن میں گاندھی جی فرماتے ہیں :-

"جب کبھی مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں نے فلاں معاملہ میں سخت غلطی (Blunder)

کی ہے۔ تو میں نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لئے۔"

اور سنئے۔ گاندھی جی نے ایک جگہ یہ کہدیا کہ "یہودی چاہتے ہیں کہ امریکہ اور انگلستان ان کی خاطر جرمنی سے جنگ چھیڑ دے" اس پر ایک شخص نے چیلنج دیدیا کہ وہ یہودیوں کے خلاف اس الزام کی تائید میں سند پیش کریں۔ غالباً گاندھی جی کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ کسی نے یوں کھلے بندوں انھیں چیلنج دیدیا ہو کہ وہ بلا سند جو جی میں آتا ہے کہدیتے ہیں۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ کہیں سے کوئی سند ہاتھ آجائے۔ لیکن سند ہو تو ہاتھ آئے۔ مسٹر جہادیو ڈیسائی اور مسٹر پیارے لال کو اس کارِ خاص پر متعین کیا گیا کہ وہی کہیں سے سند ڈھونڈھ نکالیں۔ لیکن لاحاصل۔ سند کے لئے تقاضے بڑھتے گئے۔ یہودی اخباروں نے بھی مطالبہ شروع کردیا۔ گاندھی جی بہت سٹ پٹائے۔ لیکن وہ بھی پیچھا چھوڑنے والی اسامیاں نہ تھیں۔ بالآخر اسی منزہ عن الخطاء کو کہنا پڑا کہ

"چونکہ مجھے اپنے بیان کی تائید میں کوئی سند نہیں ملی اس لئے میں اسے بلا مشروط واپس لیتا ہوں" (ہریجن ——— ۲۷ ۵/۳۹)

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اگر اتنے پائے کا کوئی مسلمان لیڈر ایسی غیر ذمہ دار حرکت کر دیتا تو نہ معلوم ہمارے نیشنلسٹ حضرات کیا کچھ کہتے اور کرتے۔ لیکن گاندھی جی ہیں کہ اب بھی ویسے ہی منزہ عن الخطاء ہیں۔ سچ ہے جب کسی کی پرستش شروع ہو جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

۴۔ **شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا** راجکوٹ کے معاملہ میں بالخصوص اور سیاستِ ہند میں بالعموم گاندھی جی کی "اندرونی روشنی" کیا کچھ کر رہی ہے اس کے متعلق کسی مخالف سے نہیں بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے سنئے:۔

"جو کچھ اس ضمن میں ہوا ہے۔ میں اس کا فلسفہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اور یہ صرف ایک راجکوٹ کے متعلق ہی نہیں۔ بلکہ اس کا اطلاق تمام سیاستِ ہند پر یکساں ہوتا ہے۔ سوال

ہمارے سامنے یہ ہے کہ کیا ہم (گاندھی جی کے) اس قسم کے فیصلوں کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرتے چلے جائیں جو بعض اوقات خود ایکدوسرے سے متضاد ہوتے ہیں - اور اُن کا کوئی معقول ربط وضبط بھی سامنے نہیں ہوتا...... ایسی باتوں کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرتے چلے جانا جنھیں ایک شخص نہ کماحقہٗ سمجھ سکے اور نہ ہی انھیں بطیب خاطر منظور کر سکے آہستہ آہستہ انسانی عقل ودانش کو مفلوج کر دیتا ہے ایسی اندھی تقلید کی بنا پر تو کوئی بڑی تحریک کبھی نہیں چل سکتی چہ جائیکہ جمہوری تحریک"۔ " (سول اینڈ ملٹری گزٹ ۵/۳۹ ۳۰)

یہی بات اگر مسٹر جناح کہہ دیتے تو آپ دیکھتے کہ کس قدر ہنگامہ برپا کر دیا جاتا۔ بہرحال دنیا میں "معبودانِ باطل" کی خدائی نہ کبھی زیادہ دن چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ پنڈت نہرو کو تو اتنی جرأت ہوگئی کہ جو کچھ دل میں تھا زبان پر لے آئیں۔ لیکن نہ ہوئی تو ہمارے ان علمائے عظام کو جو ہمیشہ اعلائے کلمۃ الحق کے بلند آہنگ دعاوی سے اپنی بیباکانہ حریت نوازی کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔ — اور نہ صرف یہ کہ انھیں اس کی جرأت نہ ہوئی بلکہ وہ ابھی تک کہتے چلے جاتے ہیں کہ کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس میں غیر مشروط طور پر جوق درجوق داخل ہو جائیں۔ اور گاندھی جی کی قیادت میں انگریز کے تعاون[1] سے انگریز کو ملک سے نکال دیں!

گاندھی جی کی قیادت — اور — جمہوریت! — انگریز سے تعاون — اور — انگریز کا استیصال!!

چند دھوکے ہیں اُن کے لئے جن کی حالت قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہوگئی ہو کہ

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۲۲/۴۶

(اُن کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دِل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر ہیں۔

۵۔ سادگی و پرکاری

کون نہیں جانتا کہ گاندھی جی کی آج کانگریس میں کیا پوزیشن ہے۔ وہ ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر ہیں۔ جن کے اشاروں پر کانگریس کی کٹھ پتلیاں ناچ رہی ہیں۔ چنانچہ مسٹر کرپلانی

---

[1] ملاحظہ ہو حقائق وعبر صفحہ ۱۳۱۔ بیان مولانا سندھی بحوالہ سول اینڈ ملٹری گزٹ

جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس ایک بیان کے دوران میں فرماتے ہیں :-

"اگر مسٹر بوس گاندھی جی کو اپنا طرفدار بنا لیتے تو کوئی شخص ان کے خلاف نہ جاتا۔ اور اگر آج بھی مسٹر بوس گاندھی جی کو اپنا طرفدار بنا لیں تو بابو راجندر پرشاد فوراً صدارت سے استعفیٰ دیدینگے۔ اور مسٹر بوس صدر بن جائینگے۔" (الواحد - ۲ ۶/۳۹)

یہ تو ہے کانگریس میں گاندھی جی کی پوزیشن۔ لیکن اُن کی دورخی کی حالت یہ ہے کہ پچھلے دنوں بمبئی کے پارسیوں نے اُن سے کہا کہ وہ حکومتِ بمبئی پر اپنا اثر ڈالیں کہ وہ امتناعِ شراب کے مسئلہ میں ایسی سخت روش اختیار نہ کرے۔ چاہیئے یہ تھا کہ گاندھی جی کہدیتے کہ نہیں! وہ تو سب کچھ ان کی مرضی کے ماتحت ہو رہا ہے اس لئے وہ انھیں اس اقدام سے روکنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ ایسی صاف گوئی سے کیوں کام لیں۔ وہ تو "مہاتما" ٹھہرے۔ اس لئے انھوں نے فرمایا کہ

اِن لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگرچہ کانگریسی حکومت کے اربابِ حل و عقد میں سے اکثر میرے رفقائے کار ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اُن کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ اور اگر میرا اُن پر کوئی اثر ہے تو اس کا راز بھی یہی ہے۔" (ہریجن ۳ ۶/۳۹)

اللہ اکبر! کس قدر درست فرمایا آپ نے کہ میں نے کبھی کانگریسیوں کے معاملات میں دخل نہیں دیا!

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

۶۔ افسوسناک غلطی امتناعِ شراب کا ذکر آتے ہی ہمیں خود بخود سر رضا علی صاحب یاد آ گئے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہندوؤں کے مذہب میں شراب حرام نہیں۔ بلکہ پوجا پاٹ اور قربانی کی بعض رسموں میں تو اس کے استعمال کے متعلق بھی سُنا جاتا ہے۔ بایں ہمہ ہندوؤں نے اِس اُمّ الخبائث کی اخلاقی خرابیوں کے پیشِ نظر اس کے متعلق امتناعی احکامات نافذ کر دیئے۔ اور از روئے قانون اس کے استعمال کو جُرم قرار دیدیا۔ لیکن اس کے برعکس سر رضا علی صاحب ہیں کہ کانگریسی حکومتوں کی اِس حماقت پر نکتہ چین

ہو رہے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اس اقدام سے ان حکومتوں کی آمدنی میں اتنا خسارہ پڑ جائے گا جس کا پورا کرنا مشکل ہوگا۔ ممکن ہے اقتصادی نقطۂ نظر سے سر رضا علی صاحب کا یہ اندیشہ درست ہو۔ لیکن ایک ایسے مذہب کے نام لیوا کی حیثیت سے جس میں شراب کا استعمال عملِ الشیطان سے ہو۔ اس کی خرید و فروخت ناجائز ہو۔ اس کا کاروبار ممنوع ہو۔ اس کی آمدنی طیب نہ قرار پائے۔ انھیں سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ سر رضا علی صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور اس کے بعد انھیں اتنی توفیق عطا ہو جائے کہ وہ اس کا اعتراف بھی کر لیں کہ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کا اعتراف عزم الامور سے ہے۔

وارد ھا اسکیم

خان عبدالغفار خان صاحب فرماتے ہیں :-

"وارد ھا اسکیم میں اسلامی نقطۂ خیال سے کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔" (نیشنل کال ۵/۳۹)

کیا فرماتے ہیں حضرات اربابِ جمعیتِ علمائے ہند جنھوں نے اپنے سالانہ اجلاس میں واضح الفاظ میں بتایا تھا کہ اس اسکیم میں یہ یہ باتیں اسلامی نقطۂ خیال سے قابلِ اعتراض ہیں۔ لیکن یہ حضرات لب کشائی کیوں کرنے لگے۔ اس لئے کہ خان صاحب موصوف تو ان کی اپنی پارٹی کے آدمی ٹھہرے اور مخالفت و موافقت اب ایام جاہلیت کی طرح پارٹی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اصول کے اعتبار سے تھوڑی ہوتی ہے!

ہاں! اور آپ کو یاد ہے کہ جمعیت کے سالانہ اجلاس (دہلی) میں ان حضرات نے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے اس اسکیم میں ان کی پیش کردہ تجاویز کے مطابق ترمیم نہ کر دی تو وہ سول نافرمانی شروع کر دینگے۔ اسکیم جوں کی توں ناقذ العمل ہوتی جا رہی ہے۔ کانگریسی حکومتوں کے زیرِ انتظام اس کے لئے ٹریننگ سکول کھل گئے ہیں۔ اس کی عام ترویج بھی شروع ہو گئی ہے۔ خود دہلی میں جامعہ ملیہ میں اس کے لئے استادوں کا مدرسہ قائم ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان منتظر ہیں کہ دیکھیں اربابِ جمعیت کب سول نافرمانی شروع کرتے ہیں۔ امتحاں ہے ترے ایثار کا۔ خود داری کا

رواداری یا بے حسی؟ جمعیت علماء کے اجلاس مراد آباد کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر مولوی عبدالسلام صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مساجد کے سامنے ہندوؤں کا باجہ بجانا مسلمانوں کے مذہبی حقوق میں کس طرح دخل اندازی کا موجب ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اگر مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی خاطر گائے کی قربانی بند کر دیں تو ان کا یہ طرزِ عمل اسلام کو کیا نقصان پہنچائے گا۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۸/۵/۳۹)

جہاں تک باجہ کا تعلق ہے ہم مولانا صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ ذرا گاندھی جی سے اتنا تو دریافت فرما دیں کہ پچھلے دنوں جب راجکوٹ میں کچھ لوگوں نے اُن کی پرارتھنا کے وقت شور مچایا تھا تو گاندھی جی اس قدر نعل بر آتش کیوں ہوئے تھے؟ انھوں نے اس واقعہ کے متعلق لکھا تھا کہ ان لوگوں کا شور ان کے کلیجہ میں تیر کی طرح لگتا تھا۔ اس واقعہ پر انھوں نے کہرام مچا دیا تھا اور تمام قومیت پرست حلقوں کی طرف سے ہنگامہ برپا کرنے والوں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا تھا۔ اُن کی آواز گاندھی جی کی پرارتھنا میں دخل اندازی کا موجب بن سکتی ہے لیکن ہمارے اِن وسیع الظرف مولانا صاحب کے نزدیک باجہ کا شور مسلمانوں کی نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا! نماز یا دیگر اوقات میں تلاوتِ قرآن کریم کے موقع پر شور مچانا تو وہ فعل ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ۴۱/۲۶

اور کفار کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ (تو خود) سنو (اور نہ دوسروں کو سننے دو۔ اس کی تلاوت کے وقت) شور مچایا کرو۔ تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

باقی رہا یہ سوال کہ ہندوؤں کے جذبات کی خاطر ذبیحۂ گاؤ کو کیوں نہ ترک کر دیا جائے۔ سو اس کے متعلق ہمیں وہ واقعہ یاد آگیا جب کفارِ مکہ کا وفد ابوطالب کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ تمھارا بھتیجہ

ہمارے بتوں کی توہین کرتا ہے۔ ہمارے آباء و احداد کو گمراہ کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے تو ابو طالب نے آپ سے کہا کہ جانِ پدر! حالت نازک ہو چکی ہے۔ قریش آپ زیادہ تحمل نہیں کرینگے۔ ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگاؤ۔ تو اس کے جواب میں حضورؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دیدیں۔ تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہیں آؤنگا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر جذبہ قابلِ احترام نہیں ہوتا۔ اور اس حقیقت سے انکار بھی کون کر سکتا ہے؟

کہدیا جا سکتا ہے کہ ذبیحۂ گاؤ کوئی فرض تھوڑا ہے محض ایک اجازت ہے۔ جسے ہم ہر وقت چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ درست ہے۔ لیکن ہندو جس طریق سے مسلمانوں کی اس اجازت کو سلب کرنا چاہتے ہیں اس کے پیشِ نظر اس کا ترک کر دینا ان کے جذبات کا احترام نہیں۔ اپنی حیاتِ ملی کی خودکشی ہے۔ ہندوؤں سے کہئے کہ وہ مسلمانوں سے درخواست کریں کہ وہ ان کے جذبات کی خاطر احساناً اس سے احتراز کریں۔ ویسے ان کو ہر وقت اس کا حق حاصل ہوگا۔ تو پھر دیکھئے کہ مسلمان اپنی روایتی کشادہ ظرفی کا کس طرح ثبوت دیتا ہے۔ لیکن ہندوؤں کی قوت سے دینے کا نام ان کے جذبات کا احترام قرار دیدینا فریبِ نفس سے کم نہیں۔ رواداری اور بے حمیتی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

پھر حیرت ہے کہ ان حضرات کو ہندوؤں کے جذبات کا تو اتنا احترام ہے لیکن خود مسلمانوں کے جذبات کا کوئی خیال نہیں۔ ورنہ یہ حضرات اپنے رفقائے کار ہندوؤں سے کیوں نہ کہیں کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مساجد کے سامنے باجہ بجانے سے احتراز کریں۔ یہ عجیب مشورہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی جذبات کی خاطر اپنے ایک جائز حق سے بھی دست بردار ہو جائیں اور اسکے بعد ہندو مساجد کے سامنے باجہ بجائیں تو اس پر بھی مسلمان برا نہ منائیں مرعوبیت کی کوئی حد ہونی چاہئے — باقی رہا جذبات کے احترام کا اصولی مسئلہ۔ سو مولانا صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام تو اس انقلاب کا نام ہے جو ایک ایک قدم پر دنیا کے ہر غیر خدائی اصول اور نظام سے ٹکرائیگا۔ پھر آپ لوگوں کے کس کس جذبہ کے احترام کی تلقین فرماتے رہینگے! حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام نام ہے چند فقہی مسائل کا— اور بس!! سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست۔

سامانِ عشق

(اسد ملتانی)

میں نے کہا کہ دیکھ مسلمان فاقہ مست!
رزمِ حیات میں کہیں کھائے نہ تو شکست

میدانِ کارزار میں خالی ہیں تیر ہاتھ
لیکن ترے حریف ہیں تیغ و سناں بدست

ساماں نہیں تو قوّتِ بازو بھی ہیچ ہے
ایمان بھی ضعیف ہے اور حوصلہ بھی پست

ڈر ہے کہیں یہ بے سر و سامانیاں تری
باطل کو کر دکھائیں نہ حق پر بھی چیرہ دست

سُن کر دیا جواب کہ یہ سب بجا سہی
لیکن کچھ اور ہے سر و سامانِ حق پرست

دل میں اگر ہو جذبۂ بے اختیارِ شوق
ہوتا ہے خود بخود سر و ساماں کا بندوبست

کیا خُوب ہے اسدؔ ترے ہمنام کا یہ شعر
کرتا ہے تازہ ولولۂ وعدۂ الست

"بے دستگہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل
شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر است"

رباعی

تقریر تو قرآن میں سنادی اپنی
اور یاد بھی اس طرح دلادی اپنی
میں نے کہا آنکھیں بھی ترستی ہیں مری
تصویر[۱] محمدؐ میں دکھادی اپنی

اخگر مرادآبادی

[۱] بایں اعتبار کہ خلقِ محمدی - تا بحدِ امکانِ انسانی - صفاتِ خداوندی کا آئینہ دار تھا - اور حضور کا اسوۂ حسنہ احکامِ قرآنی کی عملی تفسیر
(طلوعِ اسلام)

سوشلزم اور اسلام

قرآن کریم نے ایمان و اعمال صالحہ کا گراں بہا حاصل اور درخشندہ نتیجہ یہ قرار دیا ہے کہ (الغایات اُخروی کے علاوہ) مسلمانوں کو اس دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہوتی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا .... (الانفال)

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

وہ جیتے ہیں تو خدا کی منتخبہ جماعت کی طرح سرفرازی و سربلندی کی تابناک زندگی لئے ہوئے اور مرتے ہیں تو حکومت الٰہیہ کے جانباز سرفروشوں کی طرح ممتاز حیثیت سے۔ یہی ان کی امتیازی زندگی۔ یہی فرقانی شان ہے جسے قرآن کریم نے ایک شمع نورانی۔ ایک سرچ لائٹ سے تعبیر کیا ہے جس کی جگمگاتی روشنی میں وہ ظلمت کدۂ عالم کے تاریک ترین گوشوں میں بلاخوف و حزن چلتے پھرتے ہیں اور ہر راستہ کو مطلع انوار بنا دیتے ہیں۔ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ ۔ لیکن ان کی یہی امتیازی زندگی۔ یہی ممتاز حیثیت ہے جو ہر غیر مسلم کی نگاہ میں خارِ چشم بن کر کھٹکتی ہے وہ اسے دیکھتے ہیں تو بغض و عناد۔ حسد و تنگ نظری کے جانگسل انجرات اُن کے بھیچے ہوئے جہنم زار سینہ سے اُٹھتے ہیں اور ان کے قلب و دماغ پر دھوئیں کے سیاہ بادل بن کر چھا جاتے ہیں۔ وہ اس غم و غصہ کی آگ میں جھلتے ہیں اور مثلِ مارِ سیاہ۔ برخود پیچیدہ۔ جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ ۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اللہ کی نورانی شمع کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔

اسلام دنیا میں ہر طاغوتی قوت کے خلاف اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر طاغوتی قوت ہمیشہ اس فکر میں رہتی ہے کہ مسلمانوں کی اس امتیازی زندگی کو مٹا کر انہیں اپنا جیسا کرلے

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ۔ ۴/۸۹

وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح سے خود کفر کرتے ہیں اسی طرح تم بھی کفر کرنے لگ جاؤ تاکہ دونوں برابر ہو جاؤ۔

یہ طاغوتی قوتیں کہیں تو تلوار کی جھنکار اور تیروں کی بوچھاڑ میں چڑھتے ہوئے جھکڑوں۔ اٹھتی ہوئی آندھیوں، کڑکتی ہوئی بجلیوں۔ گرجتے ہوئے بادلوں۔ بڑھتے ہوئے سیلابوں۔ کف بردھاں طوفانوں کی طرح بپھرتی۔ اُمنڈتی میدان کارزار میں اعلان جنگ کرتی سامنے آتی ہیں۔ لیکن کہیں گربۂ مسکین کی طرح نرم و نازک پنجوں میں فولادی نشتر چھپائے۔ اپنے خبث باطن پر ہمدردیٔ نوعِ انسانی کی منافقت کا رنگین نقاب ڈالے۔ آنسوؤں سے تر آستینوں میں دشنۂ تیز لئے۔ بساط سیاست پر اس معصومانہ انداز سے فروکش ہوتی ہیں کہ بڑی بڑی تیز بین نگاہیں بھی دھوکہ کھا جائیں اور انہیں پیغامبران مہر و وفا سمجھ کر نہایت کشادہ ظرفی اور خندہ پیشانی سے گلے لگالیں۔ اور جبتک چھپے ہوئے فولادی پنجے شیر افضل خاں کی طرح سینے سے پار ہی نہ ہو جائیں۔ ان کے اخلاص و محبت میں شبہ نہ ہونے پائے۔ پہلی قسم کے ہجوم مخالفت سے مسلمان آسانی سے عہدہ برا ہوتا رہا۔ لیکن اس دوسری قسم کی شاطرانہ چالوں میں یہ عام طور پر مات کھا گیا۔ بدبختی سے آج ہندوستان کے مسلمانوں کو گئو سالہ پرست سامریوں کی اسی قسم کی ہلاکت آفرینیوں سے سابقہ پڑا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے مدعیان عقل و دانش مسمریزم کے معمول[1] کی طرح "عامل" کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی کے کانوں سے سنتے ہیں۔ اسی کے دل سے سمجھتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ چاہتا ہے۔ وہی کچھ زبان سے نکالتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نہ وہ امتیازی زندگی باقی ہے۔ نہ وہ فرقانی شان۔ لیکن غیر مسلموں کی ضد اور کد اور بغض و عناد کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کی جداگانہ ہستی خدا کے اس نور مبین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

---

[1] جس پر مسمریزم کا عمل کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی اس امتیازی زندگی کا راز ان کی الگ جُداگانہ جماعتی زندگی میں ہے۔ اُنکی علیحدہ ملّی ہستی میں ہے۔ ان کے غیر مخلوط قومی تشخص میں ہے۔ یہ مٹا تو ان کی امتیازی زندگی بھی مٹی اور وہ مٹی تو پھر یہ دنیا میں بالکل دوسروں کی طرح ہو گئے۔ اور یہی غیر مسلموں کی دلی آرزو ہے۔ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی جُداگانہ ملّی ہستی کو مٹانے کے لیے آج برادران وطن چاروں طرف سے یورش کرکے اُمنڈ آئے ہیں۔ جس طرح میدان جنگ میں فوج کے مختلف دستے ہوتے ہیں اور تقسیم عمل کے لحاظ سے ان کے فرائض میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن مقصد زیر نظر سب کا ایک ہوتا ہے۔ اسی طرح آج کے میدان سیاست میں ہندوؤں کی جماعتیں مختلف ہیں۔ ان کے طریق کار جُداگانہ ہیں لیکن نصب العین سب کا ایک ہے۔ اور وہ نصب العین ہے مسلمانوں کی جُداگانہ ہستی کا استہلاک۔

اس فوج کا میمنہ Right wing وہ ہے جسے گاندھی جی کا گروپ کہا جاتا ہے۔ اور میسرہ Left wing وہ جسے نوجوانوں کی جماعت قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے طریق کار مختلف ہیں۔ لیکن محاذ مشترک ہے۔ میمنہ کے پاس اپنے حربے ہیں اور میسرہ کے پاس اپنے ہتھیار میمنہ کی طرف سے کبھی واردھا اسکیم کی کمند پھینکی جاتی ہے جس میں مقصد پیش نظر یہ رکھا گیا ہے کہ بچوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ دنیا کے تمام مذاہب یکساں طور پر برسر حق ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ کوئی برتری نہیں۔ لہذا وہ تفریق جو بنا بر مذاہب قائم کی جاتی ہے انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ غیر فطری ہے۔ باہمی اختلافات کا موجب ہے۔ مذاہب سب برابر ہیں۔ البتہ فلسفۂ زندگی میں اہمسا کو ہمسا پر افضلیت حاصل ہے کبھی "ہندی۔ ہندوستانی" کا نظر فریب جال بچھایا جاتا ہے۔ اور دیوناگری کو ہندی قومیت کا مشترکہ رسم الخط قرار دیا جاتا ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے ماضی سے یکسر کٹ جائے۔ اپنی ملّی روایات کو بھول جائے۔ اپنے ادب۔ تمدّن اور کلچر۔ اپنے اسلاف کے انداز زندگی اور فلسفۂ حیات سے بیگانہ ہو جائے۔ یہ

اور اس قسم کے بہت سے حربے ہیں جو اس سمت سے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ان کے متعلق طلوع اسلام کے صفحات پر متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کا میسرہ۔ میمنہ سے بھی زیادہ پُرکار واقع ہوا ہے۔ اور ان کا حربہ بھی زیادہ مؤثر ہے۔ ملک میں افلاس غربت ناداری۔ بے کاری کے بادل چھا رہے ہیں۔ ہر سال صرف ایک پنجاب یونی ورسٹی سے کم و بیش بیس ہزار طالب علم میٹرک کا امتحان پاس کر کے بیکاروں کی فوج میں اضافہ کئے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں کی تعلیم میں مذہب کا عنصر پہلے سے غائب ہے۔ اس پر بھوک کی مار۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میسرہ والوں کے سامنے نوجوانوں کی یہی جماعت ہے اور وہ ان کی اس دُکھتی رگ سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ ان کے سامنے یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کی تقسیم۔ کافر و مسلم کے بجائے صرف دو گروھوں میں ہو سکتی ہے۔ امیر اور غریب۔ سرمایہ دار اور مزدور۔ لہٰذا روٹی کا سوال سب سے مقدم ہے مذہب۔ تمدن۔ کلچر۔ زبان۔ سب سیر شکمی کی باتیں ہیں۔ سرمایہ داری کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس زہر سے بجھے ہوئے نشتر کا نام ہے سوشلزم۔ چنانچہ اس جماعت کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں نظامِ حکومت سوشلزم ہوگا۔ اس وقت بھوک، ناداری۔ افلاس۔ بیکاری کی سب لعنتیں دور ہو جائیں گی۔ روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس نظام حکومت کے قیام میں مذہبی تفریق۔ ہندو مسلم کا امتیاز۔ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا اُٹھو اور سب سے پہلے اس روڑے کو راستے سے ہٹاؤ تاکہ اس جہنمی زندگی کے بجائے تمہیں جنتِ ارضی کی زندگی میسّر آجائے۔ بھوکا نوجوان جب اس مژدۂ جانفزا کو سنتا ہے تو بے تحاشہ اس پر لبیک کہتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ اس سے کہا جاتا ہے۔ کہتا ہے اور کرتا ہے۔ اس دستۂ فوج کے سپہ سالار پنڈت جواہر لال نہرو ہیں (جو لاکھوں روپے کی ذاتی جائداد کے باوجود سب سے بڑے سوشلسٹ ہونے کے مدعی ہیں)۔ وہ فرماتے ہیں۔

"دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵۷)

اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے ۔

"ہر پھر کر ہم اس چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام ۔ پہلے قومی دائرے میں ۔ پھر ساری دنیا میں ۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم، ریاست کی نگرانی میں مفاد عامّہ کے لحاظ سے کی جائے ۔ یہ انقلاب کس طرح سے ہونا چاہیئے؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے ۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوعِ انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے رد نہیں کی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھانے میں اس تغیر کے مخالف ہیں ۔ اگر سیاسی یا تمدّنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے" (صفحہ ۲۰-۴۱۹)

اس سے غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل سے اس "خیالِ خام" کو نکال دیا جائے کہ وہ ایک الگ ملت ہیں جداگانہ جماعتی حیثیت رکھتے ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملّتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے ۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں ۔ آج جماعتوں اور ملّتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے

(خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن)

پنڈت جی کو باقی ملّتوں اور قوموں کے متعلق کچھ زیادہ تردّد نہیں ۔ اضطراب ہے تو صرف ملّتِ اسلامیہ کے متعلق ۔ فرماتے ہیں ۔

ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم ہے ۔ جو یک جا نہیں ہے منتشر ہے مبہم ہے ۔ غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے ۔ اور بدقّت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے ۔

(میری کہانی صفحہ ۳۳۱)

اور چوں کہ مسلمانوں کا یہ دعوے کہ وہ ایک جداگانہ ملّت ہیں۔ مذہب کی بنا پر ہے۔ بلکہ ان کی ملّی زندگی کا نظام ہی مذہب ہے۔ اس لیے اس قسم کے مذہب کے متعلق پنڈت جی کا ارشاد ہے

"منظم مذہب بلا استثناء مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوّت بن کر تغیّر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ (صفحہ ۶۸-۱۶۷)

اس لیئے پنڈت جی دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ اس مذہب کو دیکھ کر میرا جی کڑھتا رہتا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دوں۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم۔

چوں کہ انہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے بھوک اور افلاس کا عذاب ان پر مسلّط ہے۔ قوم میں تشتت و افتراق کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی بجائے لامرکزیت کی انفرادی زندگی آچکی ہے۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی خاص نصب العین نہیں رہا مقصدِ حیات صرف روٹی رہ گیا ہے۔ خواہ اس کا طریق حصول کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ دو لفظوں میں یہ کہ ان کے اندر کوئی قومی کیریکٹر نہیں رہا اس لیے پنڈت جی علانیہ کہتے ہیں کہ۔

"میرے خیال میں عام مسلمان۔ عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیئے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے۔ اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائیں گے" (صفحہ ۵۰۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں آزادی کی روح موجود ہے۔ لیکن اسلامی آزادی میں اور اس آزادی میں جو پنڈت جی کے ذہن میں ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ جس چیز کو آزادی قرار دیتے ہیں اسلام اُسے الحاد و بے دینی سمجھتا ہے۔ اسلام کے نزدیک آزادی وہ ہے جو آئینِ خداوندی کی سخت ترین اطاعت سے حاصل ہو۔

پھر سوشلزم کا نظامِ زندگی پنڈت جی کا ذاتی مسلک نہیں بلکہ اعلان کیا جاتا ہے اور نہایت

ذمہ دارانہ حلقوں سے یہ آواز اُٹھتی ہے کہ ہندوستان کا آئندہ نظام حکومت سوشلزم ہوگا مسٹر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت کے دوران میں کہا کہ

"ہم ہندوستان کو ایک سوشلسٹ اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ملک کو ابھی سے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

اس کی وضاحت میں پنڈت جی فرماتے ہیں کہ موجودہ قومت پرستی تو محض ابتدائی مراحل ہیں آخری منزل تو یہی تمدنی انقلاب ہوگا جسے سوشلزم کہتے ہیں۔

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل سب سے بڑا محرک عمل رہیگا ...... یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب Social Revolution کا جذبہ پیدا ہوجائے۔" (صفحہ ۱۴۵)

پنڈت جی اور ان کے رفقائے کار نے سوشلزم کے متعلق یہ کچھ اجمالاً کہا ہے اور اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی انہیں ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ ان کاموں کے لیئے انہیں ہر جگہ ہر وقت اور ہر قیمت پر "مسلمان" تیار ملتے ہیں۔ دنیا میں بھوک کیا کچھ نہیں کراسکتی؟ چنانچہ پنڈت جی، ڈٹر کا ئم نے اس سے زیادہ جو کچھ کہنا تھا خود مسلمانوں کی زبانی کہلوایا۔ کانگریس کے "شعبۂ اسلامیات" کے ایک سابق کارکن مسٹر منظر رضوی فرماتے ہیں۔

"غریبوں مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں ...... اس پیٹ کے لیے اسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑے گی۔" (مدینہ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۶)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"آنے والی لڑائی درصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔" (مدینہ نومبر ۱۹۳۷ء)

یہ وہ وقت ہوگا جب ہندو اور مسلم کی وہ تفریق جو مذہب کی بنا پر قائم ہے۔ یکسر مٹ جائیگی اور اس کی جگہ طبقات کی تفریق لے لیگی۔ یعنی ہندو اور مسلم غریب مل کر ایک قوم بن جائینگے۔ جن میں وجہ جامعیت، رشتہ، وحدت روٹی ہوگا۔ پنجاب پراونشل مسلم لاس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکرٹیری منشی احمد دین صاحب لکھتے ہیں:

"ہم تو دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائے گی وہ محنت اور سرمایہ۔ غریب اور امیر بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہونگے گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہوں گے ..... لہذا فرقہ وارانہ جنگ طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہو جائے گی" (مدینہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء)

عدم گنجائش کی بنا پر ہم انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ ہم بتاتے کہ پنڈت جی نے جو یہ فرمایا تھا کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ کتنے جلدی سوشلزم کے دام میں گرفتار ہو جائے گا وہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ آج آپ مختلف جرائد و رسائل میں مسلمان نوجوانوں کے مضامین پڑھیئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس بیباکی اور زعم خویش "آزادی" سے خدا۔ رسولؐ۔ مذہب۔ اسلامی شعائر۔ ملی تمدن کا (نعوذ باللہ) تمسخر اڑاتے ہیں۔ ان پر پھبتیاں کستے ہیں۔ حتیٰ کہ گالیوں پر اتر آتے ہیں اور اس پر شرماتے نہیں بلکہ بڑا فخر اور ناز کرتے ہیں۔ چوں کہ ان کے معلم اوّل (پنڈت جی) خود ملحد ہیں۔ خدا کو نہیں مانتے اور سوشلزم کی بنیاد ہی دہریت پر ہے۔ اس لئے ان نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ (معاذ اللہ) خدا کی ہستی پر اعتقاد ہے۔ آپ نے کبھی غور بھی فرمایا کہ یہ کتنی گہری سازش اور کیسی خطرناک چال ہے جو اس بہ ظاہر معاشی مسئلہ کے رنگ میں چلی جا رہی ہے۔ یہی نوجوانوں کا

طبقہ کل کو ملّتِ اسلامیہ بننے والا ہے۔ اس طبقہ کے دل میں خدا اور مذہب کے متعلق اس قسم کے جذبات پیدا کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کل کی "ملّتِ اسلامیہ" اپنے کو مسلمان کہلانے میں شرم محسوس کرے گی۔ اور یوں وہ امتیاز جو انہیں بنا بر مذہب حاصل تھا مٹ جائے گا اور اس کے مٹنے سے ان کی جُداگانہ ملّی ہستی۔ الگ جماعتی تشخص خود بخود فنا ہو جائے گا۔ اور اس طرح مخالفین اسلام کے وہ تمام منصوبے جنہیں بروئے کار لانے کے لئے وہ اس درجہ مضطرب و پریشان ہیں ایک ایک کر کے پورے ہو جائیں گے۔

جب سوشلزم کا نظام ہندوستان کے مستقبل پر اس درجہ اثر انداز ہونے والا ہے اور بالخصوص جہاں تک مسلمانوں کی حیات اجتماعیہ کا تعلق ہے اس کے علمبردار اس قدر طوفان خیز انقلاب کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم معلوم کریں کہ بالآخر سوشلزم ہے کیا اور اسلام سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس چیز کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو یہ فریب دے کر کہ یہ تو محض ایک اقتصادی مسئلہ ہے اسے کسی کے مذہب اور معتقدات سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اپنے ایک تازہ مضمون میں جس کا عنوان ہے "سوشلزم کیا نہیں ہے" فرماتے ہیں۔

"اکثر لوگ سوشلسٹوں کے بارے میں منجملہ اور غلط فہمیوں کے حسب ذیل خیالات کا اظہار انتہائی متانت اور ذمہ داری سے کیا کرتے ہیں:

دنیا میں محنت کشوں اور مزدوروں کا ایک معاشی نظام کرنے کے نصب العین پر سوشلسٹ دنیا کے تمام معتقدات و خیالات کو قربان کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر اس قسم کا نظامِ حکمرانی قائم کرنے میں انہیں مذہب کی بھینٹ دینی پڑے تو وہ مطلق تامل نہیں کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس

اگر ضرورت کا تقاضا ہو تو وہ معاشرت و تہذیب کے موجودہ ڈھانچہ کو بھی
نہایت بیباکی کے ساتھ اس کے راستے میں قربان کر دینگے غرض
محنت کشوں اور مزدوروں کے مضبوط و مستحکم معاشی نظام حکمراں کے
علاوہ سوشلسٹوں کے نزدیک ہر چیز ہیچ ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے معترض اپنے بیان کی تائید میں کسی سوشلسٹ کا قول نقل کرنے یا کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے ..... میں ذمہ دارانہ طریقہ پر اور ہلکی سی بصیرت رکھتے ہوئے اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی رائے زنی سوشلزم کے بارے میں قطعاً لاعلمی پر مبنی ہے۔" (ہندوستان۔ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۳۹ء)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس قدر ذمہ دارانہ طریقہ پر اس امر کا اعلان فرمایا ہے کہ سوشلزم کے خلاف اس قسم کی تنقید "قطعاً لاعلمی پر مبنی" ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ ایسی تنقید کرنے والے معترض کسی سوشلسٹ مفکر کا قول نقل نہیں کرتے اور کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ نہیں دیتے۔ لیکن آپ سنیئے اور حیران رہ جایئے کہ خود جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے پورے مضمون میں کہیں ایک جگہ بھی نہ کسی سوشلسٹ مفکر کا کوئی قول نقل کیا ہے نہ کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یا تو سوشلزم کے متعلق خود ڈاکٹر صاحب کی معلومات بھی ایسی ہی سطحی ہیں جیسی اسلام کے متعلق۔ یا انہیں اپنے مفروضات کی تائید میں کوئی حوالہ ہی نہیں ملسکا۔ بہرحال ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے دوسرے سوشلسٹ حضرات کی واقفیت کے لیئے سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کے حوالوں سے بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے جو یہ معلوم کرنے کی تمنا رکھتے ہوں کہ اسلام کے نزدیک اس نظام زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے یہ عرض کریں کہ کتاب و سنت کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ

"مگر پڑھنے والے اور بالخصوص مذہبی لوگ ایک بات کو پہلے صاف کرلیں "دین داروں" کی نگاہ فی نفسہٖ کسی سوال کے خارجی مطالعہ پر بہت کم جاتی ہے۔ ان کے ذہن دائمی مظاہر سے مانوس ہیں۔ ان کے اکثر سوالات دین و مذہب کو مرکز مان کر پیدا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مفکروں نے برابر بدلنے والی سماج کی تقسیم بھی مسلم و کافر میں کر دی ہے۔ وہ جب سوشلزم۔ سوراج۔ فاشزم یا کسی جدید سماجی سوال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاً انہیں پہلے ذہن میں یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسلام کا حامی ہے یا مخالف اور اس کے بعد دیگر جزئیات پر متوجہ ہوتے ہیں۔ اسکی منطقی ترتیب کی آسانیاں بہت ہیں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دنیا کے چاروں طبق تھوڑی سی توجہ اور غور و فکر سے روشن ہو جاتے ہیں اور کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جہاں یہ فارمولا نہ چلتا ہو۔" (ایضاً)۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ ایک سوشلسٹ کے نزدیک یہ اندازِ فکر و نظر کس قدر لغو ہے کہ ہر نظریۂ زندگی اور ہر نظامِ حیات کو مذہب کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ایسا کہنے اور سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ، جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہوگا۔ سوشلزم کی ابتدا ہی مذہب کی مخالفت سے ہوتی ہے۔ لیکن اس مسلمان کی "مجبوری" کو کیا کیا جائے جس کے خدا کا یہ ارشاد ہو کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ ۵/۴۴

جو ان معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے ماتحت نہیں کرتا وہ دائرۂ اسلام سے خارج اور کفار کے زمرہ میں شامل ہے۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب سے نہ کوئی شکایت ہے۔ نہ افسوس۔ لیکن دلی رنج ہے ان قومیت پرست علماء کے گروہ پر جن کی آج حالت یہ ہے کہ جو لوگ ان سے سیاسی مسلک میں اختلاف رکھتے ہیں

انکے کالر ٹائی، ہیٹ، بوٹ، سگریٹ غرضیکہ ہر شے سے انہیں بُو ئے کفر آتی ہے۔ لیکن جو لوگ کانگریسی مسلک میں ان کے ہم نوا ہیں۔ وہ جو کچھ جی میں آئے مذہب کے خلاف علانیہ کہتے پھریں۔ ان حضرات کی مقدّس پیشانیوں پر شکن تک نہیں پڑتی۔ بلکہ ان سے اُن کے ایسے گہرے تعلّقات ہوتے ہیں کہ خود ڈاکٹر اشرف صاحب۔ جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی تقریب پر جمعیّت کے پنڈال میں انکے پلیٹ فارم پر تقریر کرتے نظر آتے ہیں۔ مسیلمہ کذّاب نے جب دعوائے نبوّت کیا تو اس کے متبعین سے پوچھا گیا کہ تم اس کی اتباع کیوں کرتے ہو تو اُنہوں نے کہا کہ کیا کریں ہمیں اپنے قبیلہ (ربیعہ) کا جھوٹا نبی مضر کے سچّے نبی سے اچھا لگتا ہے یہ تھی عصبیتِ جاہلیت کہ اپنے قبیلہ کا جھوٹا بھی دوسرے قبیلہ کے سچّے سے اچھا نظر آئے۔ آج وہی عصبیّت پارٹی بازی کے رنگ میں جلوہ گر ہے فرق صرف لباس میں ہے روح وہی کارفرما ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ

(۱) سوشلزم مذہب کی مخالف ہے۔ سوشلسٹ خدا کی توحید یا عبادت سے روکتے ہیں۔ اور معابد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۲) روس کے کمیونسٹ ازدواجی تعلقات میں حرام و حلال کی تمیز نہیں کرتے۔

(۳) سوشلزم قدیم تمدّن یا کلچر کی مخالف ہے، اور

(۴) سوشلسٹ تشدد پرست ہیں اور اپنے نظریہ کو بہ جبر منوانا چاہتے ہیں۔

آیئے ہم دیکھیں کہ سوشلزم کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور جن الزامات کو ڈاکٹر صاحب جیسا سوشلسٹ "بہتان عظیم" قرار دے رہا ہے وہ مبنی برحقیقت ہیں یا نہیں۔ پہلے سوشلزم کو لیجئے۔ اس کے بعد اسلام سے اس کا تقابل۔ واللہ المستعان۔

سوشلزم

سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی تعلقات کا سوال اتنا ہی پرانا ہے جتنی مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ نوعِ بشری کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح یہ مسئلہ بھی مختلف مفکرین عالم کے زیر نظر رہا ہے اور اس کے تسلی بخش جواب اور حل کے لیے بہت کچھ دماغ سوزیاں اور خامہ فرسائیاں ہو چکی ہیں، چنانچہ فیلسوفوں کے ابوالآباء افلاطون یونانی کی جمہوریت کا محرک بھی یہی خیال تھا، اور اُس وقت سے آج تک انسانی جماعتوں کی تنظیم وانضباط کے متعدد نظریوں کا مہیج بھی یہی سوال رہا ہے۔ نوعِ انسانی کے دورِ استبداد میں برسرِ اقتدار افراد نے حکومت وسرمایہ کے نشے میں غریب اور مفلس انسانوں پر جو ظلم وستم کی قیامتیں برپا کر رکھی تھیں، ان سے متاثر ہو کر کچھ ماہرینِ نظامِ عالم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک سرمایہ اور حکومت کے ان اجارہ داروں کی وہ قوت نہیں چھین لی جائے گی جس کے بل بوتہ پر یہ مفلوک الحال انسانوں پر دستِ تظلم دراز کرتے ہیں، نظامِ دُنیوی میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان داعیوں نے اپنی جدّوجہد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مطلق العنان حکومت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ یہ جذبہ بڑا مستحسن اور یہ اقدام نہایت مُبارک تھا چنانچہ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد شخصی حکومت، جمہوریت سے بدلتی گئی۔ ہر چند یہ جمہوریت بھی اسلامی جمہوریت، کے مقابلہ میں "استبداد" ہی کا دوسرا نام تھا لیکن بہرحال اس شخصی حکومت سے کسی حد تک بہتر تھی جو اس سے پیشتر وجہِ ننگِ انسانیت تھی۔ یورپ کی سرمایہ داری یقیناً ایک انقلاب کی مستحق تھی لیکن بدقسمتی سے اس انقلاب کے علمبردار وہ انتہا پسند (Extremists) تھے جو نقطۂ اعتدال سے ناواقف تھے اور ان کے سامنے سرمایہ داری کی تخریب کے بعد مساواتِ انسانی کی تعمیر کا کوئی صحیح پروگرام نہ تھا چنانچہ ان انقلاب پسند لوگوں نے ایک نظامِ زندگی وضع کیا جس کی رُو سے وہ چاہتے تھے کہ ذاتی املاک ومقبوضات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تمام پیداوار مزدوروں اور کسانوں میں

مساویانہ تقسیم کردی جائے۔ اور یوں دنیا سے بڑے اور چھوٹے کا امتیاز مٹا دیا جائے اس نظام کا نام سوشلزم ہے، اور اس کی انتہائی شکل کمیونزم کہلاتی ہے۔ لیکن یہ نظام محض اقتصادیات تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس لئے اس کے جملہ عناصر ترکیبی کو سامنے رکھے بغیر اسکے متعلق انسان کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔

اشتراکی خیالات کا مبتدع اگرچہ مزدک ہے جو ایران میں ۵۰۰ء کے قریب پیدا ہوا لیکن دورِ حاضر کی تحریک کا رہنمائے اعظم المانیہ (جرمنی) کا ماہر اقتصادیات کارل مارکس (Karl Marx— 1818-1883) ہے یہ شروع ہی سے انتہا پسند تھا، اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے اس نے کئی ایک اشتراکی اخبارات میں کام کیا، یہ خیالات ہنوز اُس کے سینہ کی پہنائیوں میں پرورش پا رہے تھے کہ وہ برسلز میں جرمن مزدوروں کی ایک خفیہ جماعت سے ملا جو اپنے آپ کو اخوان العدل (League of Just) کہتی تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس جماعت نے اپنا نام بدل کر اشتراکین (Communes) رکھ لیا۔ جس کے معنی ایسی جماعت تھے جو باتحاد یک دیگر مزدوروں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) اس زمانہ میں مارکس کو انجیلز (Engels) نامی ایک اور ماہر اقتصادیات ملا جو اس کا ہمخیال تھا اور جو مارکس کے بعد اس تحریک کا قائد اعظم سمجھا جاتا ہے۔ مزدوروں کی مذکورہ صدر جماعت نے ۱۸۴۷ء میں ایک جلسہ کیا جس میں انہوں نے مارکس اور انجیلز سے درخواست کی کہ وہ اس جماعت کی وجہ تخلیق اور اس کے اغراض و مقاصد کا ایک دستورِ اساسی مُرتب کر دیں۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء کو یہ دستورِ اساسی منشورِ اشتراکیت (Communist Manifesto) کے نام سے شائع ہوا یہی دستور موجودہ اشتراکیت کا نصب العین ہے اور وحی مُنزل کی طرح واجب التسلیم مانا جاتا ہے انہیں دنوں (۱۸۴۸ء میں) شاہ جرمنی نے قومی مجلس کو برخواست کر دیا جس سے متاثر ہو کر مارکس اور اسکے رفقائے کار نے عوام میں یہ تحریک شروع کر دی کہ وہ ٹیکس ادا نہ کریں اور حکومت کی مخالفت کیلئے مسلح جماعتوں کی تنظیم شروع کر دیں۔ حکومت نے اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا اور اسے ملک بدر کر دیا۔ یہ

پہلے فرانس پہونچا اور وہاں سے انگلستان آگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جرمنوں کی کمیونسٹ جماعت نے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل کرلی۔ چنانچہ اس جماعت کی برسلز کی شاخ نے اپنا نام بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت (International working men Association) رکھا، اور مارکس کو اس کا صدر بنایا۔ انہوں نے ۱۸۶۴ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جسے اشتراکیت کی پہلی بین الاقوامی (کانفرنس) کہتے ہیں۔ لیکن اشتراکین اور انارکسٹ (بے نظمی اور بے آئینی کے علمبرداروں) کے باہمی اختلافات کی بنا پر یہ کانفرنس ٹوٹ گئی۔ زاں بعد ۱۸۸۹ء میں اس کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس ہوئی، لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کی بنا پر اس کی مختلف شاخوں میں پھر اختلافات رونما ہو گئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں اُس کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جو درحقیقت اس عالمگیر تحریک کا سنگ بنیاد ہے۔ اس آخری کانفرنس نے دوسری کانفرنس کے معتدلین کے طریق کار کو مذمت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنا رشتہ واتحاد پہلی بین الاقوامی سے منسلک ومنوط کرکے ہر قسم کے جارحانہ تشدد وغارتگری کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ جو اُن کے نزدیک مارکس کے نظریہ کی اصل ہے۔

یہ تحریک یُوں تو آتش خاموش کی طرح سلگتی سلگاتی مختلف اقوامِ عالم میں اثرانداز ہوتی رہی، لیکن جہاں یہ رعد آسا دھماکے کیساتھ اُبھری وہ روس کا میدان تھا ویسے تو ۱۹۰۵ء کی انقلابی تحریک ہی سے رُوس میں اُس کے آثار نمودار ہو چکے تھے، لیکن ۱۹۱۷ء میں زار روس اور اُس کی حکومت کے خلاف ایک طوفان انگیز شورش برپا کی گئی۔ جس کا سرغنہ لینن (Lenin—1870-1924) تھا، اس انقلاب نے حکومتِ روس کا تختہ الٹ دیا۔ اور اشتراکین کی جماعت جس کا مقامی نام بالشویک تھا۔ برسرِ اقتدار آگئی۔ اُن کی پہلی مجلس انتظامیہ چونکہ مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل تھی جنہیں سوویٹ (Soveit) کہتے تھے۔ اس لئے اس نظامِ حکومت کا نام بھی سوویٹ رُوس کی جمہوریت رکھا گیا۔ لینن اس جماعت کا صدر تھا جس نے، جنوری ۱۹۱۸ء کی شب کو آئینی نظامِ حکومت کی اسمبلی کو برطرف کرکے اپنی آمریت (Dictatorship) کا اعلان کردیا۔ لینن ۱۹۲۴ء میں مرگیا اور اس کی جگہ سٹیلن (Stalin-1879) ڈکٹیٹر

مقرر ہوا۔ روس میں اگرچہ کمیونسٹ جماعت ہی برسر اقتدار ہے لیکن ہنوز وہاں نظام حکومت و معاشرت کمیونزم کے مکمل دستور کے مطابق عمل میں نہیں آیا۔ یوں سمجھئے کہ بعض صورتوں میں سوشلزم اور بعض میں اس سے زیادہ متشدد طریق حکومت کارفرما ہے۔ البتہ کمیونسٹ جماعت تدریجاً اس نظام کو بدل کر اشتراکیت کے آخری نقطہ کی طرف لئے چلی جا رہی ہے۔ بہرکیف تحریک اشتراکیت کا آتش دان آج روس میں ہے اور وہیں سے اس کی چنگاریاں اڑا اڑا کر نظام عالم کے خرمن امن و طمانیت کو جلانے کے سامان فراہم کر رہی ہیں۔

موجودہ اشتراکیت کے اصول و طریق کار کی تفصیلات جو مارکس، انجیلز، لینن، اسٹیلن اور ان کی روسی جماعت کے ارباب حل و عقد کی تحریر و تقریر سے ماخوذ ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) معاشی اور معاشرتی نظام

مارکس اپنے منشور اشتراکیت (Communist Manifesto) کے شروع میں لکھتا ہے۔

"سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسر اقتدار آکر، عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کر دینا ہے"

پھر لکھتا ہے کہ۔

"اس تحریک کا مقصد وحید یہ ہے کہ دنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی و انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدوروں کی جماعت کو تسلط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے تمام املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے، اور یوں ملکی پیداوار کے تمام وسائل و ذرائع مزدوروں کی جماعت کی حکومت کے ہاتھ میں مرکوز کر دیئے جائیں"

ایک اور جگہ رقمطراز ہے۔

"اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو پوشیدہ رکھنے سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ان کے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظام معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔ برسر اقتدار جماعتوں اور طبقوں کو اشتراکی انقلاب سے خوف کھانا اور ڈرنا چاہیئے۔ مزدور اس انقلاب میں کچھ نہیں کھوئیں گے، انہیں تو ایک دنیا کو فتح کرنا ہے۔"

اسی اصل الاصول کی تائید کمیونزم کے مختلف لٹریچر کے ذریعہ سے ہوتی رہتی ہے چنانچہ ہندوستان میں نظام عملی کا مسودہ ("Draft platform of action in India") مطبوعہ ڈیلی ورکر (لندن) کی تیسری شق یہ ہے۔

"ہر قسم کی ذاتی ملکیت مثلاً زمین، جنگلات، سرمایہ، جاگیرداران، والیان ریاست، اور مذہبی عبادت گاہوں کی تمام جائدادیں بلا کسی معاوضہ کے ضبط کر لی جائیں۔"

"اشتراکی نظام شمسی" (Communistic Solar System) مطبوعہ لیبر پارٹی لندن کے شروع میں ہے۔

"اشتراکی بین الاقوامی کا مقصد یہ ہے، کہ وہ ایک منظم و مسلح لڑائی کے ذریعے سے بین الاقوامی سرمایہ داری کا انہدام کرے اور اس کی جگہ بین الاقوامی سوویٹ جمہوریت کو قائم کرے، جو سرمایہ داری کے مکمل استیصال تک ایک درمیانی ارتقائی منزل کا کام دے۔"

(V-Adorntsky) جو کہ "مارکس، انجیلز، لینن انسٹیٹوٹ، ماسکو" کا ڈائرکٹر ہے۔ اپنی کتاب (Dialectical Materialism) کے صفحہ پر لکھتا ہے۔

"جماعتی جنگ کے ذریعہ سے اور ڈکٹیٹرشپ کی مدد سے، اشتراکیت جماعتی امتیازات

وتفوق کو مٹا کر ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل کرے گی، جس میں طبقاتی امتیازات کا وجود نہ ہوگا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مدیر مارکس ولینن کی اسناد سے اشتراکیت کے حاصل الحصول کے متعلق لکھتا ہے۔

"مشترکہ ملکیت، وسائل پیداوار کا اجتماعی نظم ونسق اور انفرادی وشخصی حقوق واملاک کا مکمل انقطاع، سوشلسٹوں کا نصب العین حیات ہے"

(۲) مذہبی نظام کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت ایک خالصتہً اقتصادی اور سیاسی تحریک ہے، جسے مذہب سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن مدعیانِ تحریک کے نزدیک سب سے پہلے مذہبی انقلاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دنیا میں غریب انسانوں پر جس قدر ظلم واستبداد کی قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں سب مذہب کے وجود سے ہیں۔ اور ان مصائب وآلام کا استیصال اُس وقت تک ناممکن ہے جبتک لوگوں کے دلوں سے خدا کے وجود کا ایمان قاطبتہً مٹا نہ دیا جائے۔ اس لئے کہ۔

"دنیا میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا استبداد کا حامی خود خدا ہے"

(Bolshevism by Edmand Candler)

اور خود لینن خدا کے تصور کی ابتدا کی وجہ یوں بیان کرتا ہے۔ کہ

"سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہنِ انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے۔ جس سے ایک حاکم اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی، اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ سو جبتک خدا کا تخیل ذہن انسانی سے فنا نہ کر دیا جائے، یہ لعنت کسی طرح دُور نہیں ہو سکتی"

(Hammer and Sickle by Mark Patrick)

لینن، مارکس کے حوالہ سے اپنے ایک مقالہ مطبوعہ لیبر منتھلی بابت دسمبر ۱۹۲۶ء میں لکھتا ہے۔

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے، اس لئے نظریہ مارکس کی رُو سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں۔ جن کی توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال

کیا جاتا ہے اور انہیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا نفس مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔ تا آنکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے"

مبادیات اشتراکیت (A. B. C. of Communism) مصنفہ (Buhareu Preobrazbensky) کے باب ۹ میں لکھا ہے۔

"اشتراکیت کے نام لیواؤں کا اولین فرض ہے کہ مارکس کے اس قول کو کہ مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔ عام جماعتوں کے ذہن نشین کرادیں اور انہیں یقین دلادیں کہ ازمنہ گذشتہ میں کیا اور دورِ حاضرہ میں کیا متمرد اور سرکش انسانوں کے ہاتھ میں مذہب ہی ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ دُنیا میں عدم مساوات، جماعتی تفریق اور غضب و استبداد کو روا رکھا جاتا ہے۔ اور جس کے نام سے مزدوروں کی جماعت سے سرمایہ کے دیوتا کی پُوجا کرائی جاتی ہے"

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتا ہے۔

"مذہب اور اشتراکیت عملی اور نظری ہر دو حیثیتوں سے بالکل متضاد و متبائن ہیں"

ص ۲۵۶ پر ہے کہ

"جو اشتراکی اپنے مذہبی عقیدے کو بھی ساتھ ساتھ رکھتا ہے، اسے اشتراکیت سے کچھ واسطہ نہیں"

(Lenin and Gandhi) کا مصنف (Rene Fulop Millor) لکھتا ہے۔

"لینن نے بار بار اپنی تقریر و تحریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اشتراکین کے عوام و خواص کا نصب العین حیات ہی یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ممکن کوشش صرف کر دیں کہ خدا سے اس کا غلبہ و تسلط سطوت و حکومت چھن جائے، کیونکہ اشتراکی نظام کا بدترین

دشمن خدا کا وجود ہے"

مقدمۂ سازش (میرٹھ) کے ملزم مسٹر نمبکار نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

"ہم اس امر کو صیغۂ اخفا میں رکھنا نہیں چاہتے کہ ہم (اشتراکین) دنیا کے تمام مذاہب کے خلاف ہیں اور ہم کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ دنیا میں مذہب کی تبلیغ ہو یا کوئی اشتراکی، مذہبی عبادات و مناسک کو ادا کرے"

اس کی تصدیق دوسرے ملزم مسٹر ادھیکار نے ان الفاظ میں کی تھی۔

"ہم بہ حیثیت اشتراکین، اور مادہ پرست مذہب اور خدا کے دشمن ہیں۔ لینن نے اسی بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ مذہب کے خلاف بھی جنگ اسی زور و شدت سے جاری رکھی جائے جس طرح جماعتی تفریق کے خلاف جنگ ہو۔ چنانچہ اشتراکین کی پانچویں کانفرنس میں مذہب کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا وہ بالکل عیاں ہے کہ سرمایہ داری کے تعصبات اور توہم پرستی کے مقابلہ کے لئے سب سے پہلے مذہب سے جنگ کرنا ہوگا، اور اس کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بالخصوص مزدوروں کی اس جماعت میں جہاں اُن کی روزانہ زندگی میں مذہب عمیق اثر پیدا کر چکا ہے"

چنانچہ پانچویں کانفرنس کے محولۂ بالا شق کے الفاظ یہ ہیں۔

"مذہب، حکومت اور کلیسا کے خلاف جنگ کرنا"

اس اصول اور اصول کی فروعی تصریحات کے ماتحت ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء کو حکومت سوویٹ نے فیصلہ کر دیا کہ قحط سالی کے دفعیہ کی آڑ میں تمام عبادت گاہوں کی املاک ضبط کر لی جائیں۔

"(Russia Reported by Walter Duranty—1921-1933)

یہی نہیں بلکہ ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر (Julius F. Hecker) نے اپنی کتاب موسومہ (Religion under the soveit) جو درحقیقت روس کی تائید میں ہے لکھا ہے۔

"بالشویک کٹر مادہ پرست اور دہریہ ہیں مذہب ان کے نزدیک دورِ جہالت کی قلبی گمراہی کا نام ہے، یا ایک فریب ہے یا "افیون" ہے اور کلیسا ان کے نزدیک اقتدار پسند جماعتوں کا ایک ڈھونگ ہے جو زیر دست انسانوں کے تذلل اور تعبّد کی خاطر وضع کیا گیا ہے، ان کے نزدیک اشتراکیت کی تہذیب جدید میں مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔"

پھر لکھا ہے۔

"اشتراکیین محض اپنی جماعت کے اراکین سے ہی اس دہریت کا اقرار نہیں لیتے۔ بلکہ غیر اشتراکیین میں بھی ان عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں، اور آنے والی نسلوں کا افراد کے نصابِ تعلیم کی اس انداز سے تشکیل کرتے ہیں۔ کہ وہ خود بخود ایسے لامذہبی معتقدات کو ذہن میں لئے ہوئے آگے بڑھیں۔"

آگے چل کر تحریر ہے۔

"ان کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی ہے اس کے بعد پھر وہ کسی اخروی زندگی کے قائل نہیں۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے ان کی سوسائٹیاں قائم ہیں جنہیں جمعیت منکرینِ خدا (Union of the Godless) کہا جاتا ہے۔

ان جماعتوں کو اشتراکی پارٹی کی پوری امداد حاصل ہے۔"

۱۹۳۷ء میں اسی انجمن (منکرین خدا) کے صدر (Yaroslavsky) کی تقریر کے اقتباسات اخبارات میں شائع ہوئے تھے جن میں اس نے اپنی انجمن کے اراکین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

"چونکہ خدا کے خلاف پروپیگنڈا کچھ سست پڑ گیا ہے اس لئے خطرہ ہے کہ مذہب کا شگوفہ پھر نہ پھوٹ نکلے۔ لہذا ضرورت ہے کہ پروپیگنڈا نہایت شد و مد سے کیا جائے۔"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۲ ۔ ۔ ۔ ویلیڈر مورخہ ۱۶ ۔ ۔ ۔)۔

ہندوستانی سوشلسٹوں کے سپہ سالار پنڈت نہرو مذہب کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ سنئے!!

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے۔ اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین، اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق رکھنے والوں کی بقا کا حامی ہے۔"

(میری کہانی ص۱۴۲)۔

(۳) اخلاق اشتراکیت کا یہ جہاد، صرف خدا اور اس کے متعین کردہ قوانین کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ اس تجدد پسندی کے نشہ میں وہ ہر اس اخلاقی قانون اور ضابطہ کو کالعدم کر دینے پر تلے بیٹھے ہیں جو معلم اخلاق یا سوسائٹی کے اراکین نے نظام امنیت عالم کے لئے وضع کیا ہو چنانچہ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی ما فوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں، ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اسی قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت و سطوت کا استحکام و استبقا کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے، نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں"

(Lenin and Gandhi)

اسی حقیقت کا اعادہ "مبادیات اشتراکیت" میں ان جامع الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"جو کچھ جماعتی جد و جہد کی تائید میں ہو، عین حلال و درست۔ اور جو اس کے راستہ میں مزاحمت کرتا ہو حرام و ناجائز"

یہ نظریہ اشتراکیت میں کچھ بعد کی پیداوار نہیں۔ یہ تمام عمارت ان بنیادوں پر استوار کی گئی ہے جس کی داغ بیل خود مارکس نے اپنے منشور میں ان الفاظ میں ڈالی تھی۔

"اشتراکیت کے انقلاب میں ان تمام کہنہ خیالات کی تبدیلی مضمر ہے جو مختلف ادوارِ عالم میں مختلف شکلوں میں رونما ہوئے ہیں"

(۴) نظامِ عائلی مذہب و اخلاق کی حدود و قیود کو توڑ کر سب سے پہلے مرد و عورت کے جنسی تعلقات کو تمام اغلال و سلاسل سے آزاد کیا گیا ہے۔ خدا سے انکار اور مکافاتِ عمل کے اعتقاد سے بیگانگی کا اولین نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ فطرتِ انسان پر جذباتِ بہیمہ غالب آ جائیں اور خواہشات سفلیہ قوائے ملکوتی کے حسن ازلی پر خباثت و رذالت کے گھناؤنے پردے ڈال دیئے

چنانچہ سب سے پہلے یہ آواز ۱۹۰۷ء میں (Artisybashev) نے ایک ناول (Samine) نامی میں بلند کی۔ وہ لکھتا ہے۔

"خواہشاتِ نفسانی کو بلا قیود و پابندی فرد کرنا ہی عین فطرت ہے۔ اس کے لئے نہ ضمیر کی آواز کی پرواہ کرنی چاہئے اور نہ ہی خدا اور انسانوں کے وضع کردہ اصولوں سے خائف ہونا چاہئے۔ بادہ نوشی اور حرامکاری میں کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس سے انسان خواہ مخواہ شرماتا پھرے۔ تند و تیز مے نوشی اور مہیج جذبات فحش کاری فطرتی جذبات ہیں۔ اور جو چیز فطری ہو وہ ناجائز کیسے ہو سکتی ہے"[1]

چنانچہ (Samine) کی اس صلائے عام پر بہت سے نوجوان مرد و عورتوں نے لبیک کہا، اور بلا قیود ہوس رانیوں کی عام سوسائٹیاں وجود میں آ گئیں۔ اسی طرح وہاں شراب کی بھی بیشمار قسمیں رائج ہو گئیں۔ چنانچہ مسٹر (Alexander Wicklead) نے اپنی کتاب

---

[1] (Religion under the Soveit)

(Ten years in Soveit Russia) میں بادہ نوشی کی کمی قسمیں گنائی ہیں۔

لیکن اس کا بہت گہرا اور خطرناک اثر سلسلۂ ازدواج و مناکحت پر پڑا جس پر مدنی الطبع انسان کی عائلی زندگی کا کلیتہ دار و مدار ہے چنانچہ زمین، سرمایہ اور جائداد کی طرح اشتراکیت کی رُو سے عورت بھی تمام افراد جماعت کی مشترکہ ملکیت ہے جس کی تقسیم ماحصل محنت کی تقسیم کی طرح حکومت کرتی ہے۔ کوئی شخص کسی عورت کو اپنی بیوی نہیں کہہ سکتا۔ عورت حکومت کی ملکیت اور سب کی بیوی ہے۔ اس اشتراک کا تخیل بھی اشتراکین کے مورثِ اعلیٰ مزدک ایرانی کی "رفعت اخلاق" کا رہینِ منت ہے۔ چنانچہ اس کے نظامِ اشتراکیت میں بھی مناکحت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، عورت مشترکہ بیوی، اور بچہ حکومت کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔ (ملاحظہ ہو (Enc. of Religions and Ethics)

روس میں ابھی اشتمالیت کے طرز کی حکومت ہے۔ جو اشتراکیت سے کہیں معتدل اور نرم رو ہے۔ لیکن وہاں عورت و مرد کے جنسی تعلقات کے لئے کسی نکاح و عقد کی بندش ضروری نہیں۔ جبتک کسی جوڑے کا جی چاہے میاں بیوی کی حیثیت سے رہے۔ البتہ اعداد و شمار کی سہولیت اور قانون کی دیگر شقوں میں آسانی کی خاطر اتنا ضروری ہے کہ وہ کسی مجسٹریٹ کے سامنے جاکر اپنے ان تعلقات کی اطلاع کردیں یہ محض رسمی سی بات ہے۔ ورنہ رجسٹری شدہ اور غیر رجسٹری شدہ میاں بیوی کی اولاد میں قانوناً و عرفاً وہاں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہاں جو شادیاں مذہبی قواعد کے مطابق سرانجام پاتی ہیں حکومت انہیں قانوناً تسلیم نہیں کرتی (ملاحظہ ہو (Soveit union year book for 1928)

شادی کی غرض و غایت وہاں تولید و افزائش نسل انسانی یا نظامِ عائلی کی طرز پر زندگی بسر کرنا نہیں بلکہ محض تعیش و ہوس رانی ہے مانع حمل تدابیر اگرچہ آج تمام مہذب دنیا میں رائج ہو چکی ہیں لیکن روس میں اس کے لئے حکومت کی طرف سے باقاعدہ ریسرچ انسٹیٹوٹ کھلے ہوئے ہیں۔ یورپ اور دیگر مہذب ممالک میں ابھی حرام کاری کے نتائج کو بالعموم چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ اس سے صنفِ نازک کی عفت پر دھبہ لگتا ہے اور مانع حمل تدابیر زیادہ تر لامحالہ اس لئے اختیار کی جاتی ہیں کہ اولاد پیدا نہ ہو۔ یہیں اسقاطِ حمل قانوناً جائز ہے اور حکومت کی طرف سے مخصوص ہسپتال صرف اس غرض

کے لئے کھلے ہوئے ہیں کہ ان میں اسقاطِ حمل منظم طریقہ سے عمل میں لایا جائے۔ دیکھئے
(Modern Russia by Cecil Hamilton)

مناکحت کے بعد طلاق کا سوال آتا ہے۔ طلاق حاصل کرنے کے لئے متعاقدین میں سے کسی ایک کا عدالت میں جا کر صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اسے فریق ثانی کے ساتھ رہنا منظور نہیں۔ (Soveit year book-1929) اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ فریق ثانی کو بھی اس کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ (Modern Russia) کی مصنف کے بیان کے مطابق روس میں نصف چھٹانک مکھن حاصل کرنے کے مقابلہ میں طلاق حاصل کرنا آسان ہے۔ خاتون موصوفہ رقمطراز ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صبح کو مرد رہتا سہتا گھر چھوڑ کر گیا ہے، لیکن شام کو واپس آیا تو گھر میں نہ بیوی موجود ہے نہ بچے۔ صرف ایک اطلاعی کارڈ رکھا ہوا ہے کہ بیگم صاحبہ آج کسی اور کی زینت آغوش ہوں گی۔

طلاق کے بعد بچے کی کفالت کا ذمہ دار مرد کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر باپ عدالت میں یہ ثابت کر دے کہ ماں کا تعلق بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ تھا، تو بچے کی کفالت کے اخراجات سب میں برابر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ (Mordern Russia)

حکومت نے لاوارث بچوں کے لئے پرورش گاہیں بنا رکھی ہیں لیکن مسٹر (Domillett) بلجیم قونصل کے قول کے مطابق وہاں قریب پچاس لاکھ بچے لاوارث مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں نہ کھانے کو ملتا ہے نہ رات کو سونے کے لئے چھت میسّر ہے۔

ایک ممتاز روسی سائنس دان (Anton Nemilo(e) جو اشتراکیت کا پُرجوش حامی ہے۔ اپنی کتاب (Biological Tragedy of Women) میں اعتراف کرتا ہے کہ مَردوں میں صنفی انارکی (حدود شکنی و قیود فراموشی) عام ہو گئی ہے چنانچہ وہ تنبیہ کرتا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو اشتراکی نظام تباہ ہو کر رہے گا۔

مشہور اشتراکی اخبار (Prauda) میں اب سے چند سال قبل ایک مضمون نکلا تھا،

جس میں درج تھا۔

"محبت کے معاملہ میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان سب اصولوں کی تہہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر زیادہ تم حد کو پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یا بالفاظِ دیگر جس قدر زیادہ تم حیوانیت کے قریب ہوگئے، اسی قدر زیادہ تم اشتراکی ہوگئے لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس بات کو اصول متعارفہ میں سے شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اس کو اپنے اُوپر کوئی قید عائد نہیں کرنی چاہئے۔ اس طرح کے اصولِ متعارفہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر یہ لازم ہے کہ جب اس کے نوجوان ساتھیوں میں سے کسی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا حیل وحجت اپنے آپ کو اس کے سُپرد کردے" (بحوالہ ترجمان القرآن - ۱۲/۱)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ جب اشتراکیت کی معتدل شکل اشتمالیت میں نظام عائلی کا یہ حال ہے تو اصل اشتراکیت میں تو خانگی زندگی کا وجود ہی مٹ جائے گا۔ مذکورہ صدر واقعات سے قطع نظر جب اشتراکیت کا اصول ہی یہ ہے کہ عورت املاک انسانی کی طرح جماعت کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اور جنسی تعلقات کے لئے نکاح وپابندی کی ضرورت نہیں تو اشتراکیت میں عائلی زندگی کا جو حشر ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ نہ خون کے رشتے رہیں گے نہ ترکہ وراثت کا سوال ہوگا نہ کوئی عورت محرمات میں سے ہوگی۔ نہ کوئی باپ کہلائے گا نہ بیٹا کسی سے منسوب ہوسکے گا۔ نہ کسی کی کوئی بیوی ہوگی۔ نہ بیوی کا خاوند ہوگا نہ ہمشیرہ کی تمیز ہوگی نہ ماں کی پہچان غرضیکہ انسانوں کی بستیاں حیوانوں کا وسیع جنگل ہوگا جہاں جذبات شہوانیہ کے فرو کرنے کے لئے متضاد جنسوں کے افراد اکھٹے رہتے ہوں گے۔

(۵) طریق کار

مارکس کے منشور کے بعد تحریک اشتراکیت میں لینن کی کتاب (State and Revolution) گویا عہد جدید کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں لینن لکھتا ہے۔

"سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکین کی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ممکن نہیں"

پھر دوسری جگہ لکھتا ہے۔

"مزدوروں کی جماعت کی آزادی تشدد آمیز انقلاب اور موجودہ نظامِ حکومت کی مشینری کی مکمل تخریب کے بغیر ممکن نہیں"

اسی کتاب کے صفحہ ۶۴ پر انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار وارادہ قوت واستیلا، نوک شمشیر، گولیوں کی بوچھار اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی مسلط کر دیتا ہے"

اور یہ کہ۔

"ہم حکومت کی مشینری کی مکمل تخریب اس انداز سے چاہتے ہیں کہ مسلح مزدوروں کی جماعتیں تمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں"

۱۹۰۵ء کے انقلاب روس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔

"ہم اس حقیقت کو بالکل چھپانا نہیں چاہتے کہ اس کے بعد جو انقلاب ہوگا وہ جارحانہ خون آشام اور ہلاکت آفریں جنگ ہوگی"

A. B. C. of Communism جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

انہیں خیالات سے لبریز ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ان حالات کے ماتحت مزدوروں کی جماعت کے لئے خانہ جنگی Civil War بالکل لانیفک ہو جاتی ہے۔ اسی کتاب کے آخری باب میں ان تمام تفصیلات کو اجمالاً ان الفاظ میں قلمبند کیا گیا ہے۔

"اشتراکیت کا انقلاب صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ وہ عالمگیر شکل

اختیار کرلے۔"

(Stalin) اپنی مشہور کتاب (Leninism) میں بھی انہی تدابیر کو بروئے کار لانے پر زور دیتا ہے۔ روس کی کمیونسٹ جماعت نے ۱۹۱۹ء میں ایک لاسکی پیغام دنیا کی کمیونسٹ جماعت کے نام بھیجا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کے یہ بھی تھا کہ۔

"اس جدّوجہد اور جنگ وجدل کا طریق عمل یہ ہوگا کہ جمہور مزدور کی جماعت میدان عمل میں آجائے۔ اور سرمایہ داری نظام کے خلاف ہر اس ہتھیار سے کام لے، جو ان کے ہاتھ آجائے۔"

اس کے بعد کمیونسٹ روس کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی جس میں مزبورہ صدر تدابیر سے اتفاق کرتے ہوئے مقاصد انقلاب کے ماتحت قرار پایا کہ۔

"بین الاقوامی اشتراکیت اپنا نصب العین یہ مقرر کرتی ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ داری کے نظام حکومت کے خلاف مسلح جنگ شروع کردے۔"

ازاں بعد ۱۹۲۴ء میں پانچویں کانگریس میں ان امور کے جزئیات و فروعات کی تفصیل طے پائی۔ چنانچہ اس کی روئداد میں ہے۔

"وقت آگیا ہے کہ تمام اشتراکین پر یہ فرض کردیا جائے کہ تمام ممالک عالم میں خواہ وہ جماعتی جنگ کے اعتبار سے آزاد، قانون پسند اور امن جو ہی کیوں نہ ہوں، منظم طریق پر جماعت کے ایسے کاموں میں شریک ہوجائیں، خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔"

یہی چیز ٹراٹسکی نے اپنی کتاب (Defence of Terrorism) میں پیش کی ہے جہاں وہ لکھتا ہے کہ۔

"انقلاب کا تقاضہ ہے کہ وہ انقلاب پسند جماعتوں سے مطالبہ کرے کہ جو قوت ان کے حیطۂ اختیار میں ہو، اُسے بروئے کار لے آئیں۔ اگر ضرورت ہو تو ایک مسلح شورش کے ذریعہ اور اگر مناسب سمجھیں تو دہشت انگیز طریقوں سے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں۔

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے۔ اس لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے ..... یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جاسکیں گے، یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنی جبر و تشدد سے کام لئے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔ (میری کہانی ص ۴۵۶-۵۷)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا فیصلہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں، اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا کیونکہ جبتک بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہو گی" (میری کہانی ص ۴۶۹-۷۰)۔

چونکہ جماعتی مفاد کے حصول کے لئے اشتراکیت میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھی گئی، اس لئے ان کے نزدیک حلیف و حریف برابر ہیں۔ عہد و پیمان اور میثاق و معاہدہ کوئی شے نہیں۔ بظاہر دوست ہوں گے لیکن اس دوستی کے پردہ میں تخریب و استہلاک کی ہر ممکن کوشش بروئے کار لے آئیں گے۔ لہٰذا ان پر نہ امن و صلح کے زمانہ میں کوئی بھروسہ نہ جنگ و قتال کے وقت کسی ایفائے عہد کی توقع۔

اشتراکیت کے آہنی اصول۔ اور ان اصولوں کے پروپیگنڈا کا اثر ہے کہ ۱۹۱۷ء کے بعد آج تک اقصائے عالم کا کوئی گوشہ امن و امان کی زندگی بسر نہیں کر سکا ہر ملک اور ہر طبقہ میں عدم اطمینان و فقدان سکون کی ایک

روپھیل گئی ہے جو مختلف قسموں کے انقلابات کی شکل میں آئے دن امن عامہ پر برق خاطف بن کر گرتے رہتے ہیں چنانچہ ۱۹۰۵ء میں انقلاب روس کے بعد ۱۹۰۶ء میں ایران میں ۱۹۰۸ء میں ترکی میں اور ۱۹۱۱ء میں چین میں انقلابات کا سیلاب اُمڈا۔ یورپین ممالک میں یہ انقلابات اسٹرائک کی شکل میں پیدا ہوئے ۱۹۱۱ء میں ریلوے کی جنرل اسٹرائک ہوئی۔ اسی طرح ۱۹۱۰ء میں جرمنی میں عام نیابت کے لئے مزدوروں نے مظاہرے کئے اور روس میں ۱۹۱۴ء میں باکو وغیرہ کے کارخانوں میں اسٹرائک ہوئی۔ پھر جنگ عظیم کے بعد تو ان انقلابات کو پوچھئے ہی نہیں۔ تاریخ عالم میں جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے وہ اب دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ اور اگر دس بیس سال اُدھر کی تاریخ کے اوراق آج سے سو سال پیشتر کے کسی مدبر و سیاست دان کے سامنے رکھ دئے جائیں تو وہ انہیں کبھی حقیقت پر محمول نہ کرے گا بلکہ محض افسانہ طرازی سمجھ کر خاموش ہو رہے گا۔ پھر روس میں ان انقلابات کی وجہ سے نوعِ بشری جن لرزہ فگن اور جگر پاش مصائب و آلام کا شکار ہوئی ہے اُس کی نظیر تو شاید ہی کہیں ملے۔ دنیا بھر کی تاریخ کے رنگین اوراق کے مقابلہ میں اکیلے روس کی خونی داستان کا پلڑا شاید جھکتا ہی نظر آئے گا۔ اور ؎ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نظامِ حکومت

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایسی تمثیلی سوسائٹی (Ideal Society) کی تشکیل کے بعد جس کے خواب مدعیان اشتراکیت دیکھ رہے ہیں اشتراکیت کا نظام حکومت کیا ہوگا؟ اس کے متعلق (Stalin) اپنی کتاب (Leninism) میں لکھتا ہے۔

"لینن ازم (عہد حاضرہ کی اشتراکیت) سے مُراد مزدوروں کی جماعت کے ڈکٹیٹر مقرر کرنے کا نظریہ اور اس نظریہ کی عملی ہیئت کذائی ہے"

اس کے بعد ڈکٹیٹرشپ (Dictatorship) کی تفصیل خود لینن کے الفاظ میں یوں لکھتا ہے۔

"ڈکٹیٹر ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظام حکومت کے علمبردار سُن لیں اور خوب غور سے سُن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں "قوت" غیر محدود اور قاہرہ قوت۔ جو

جبر و اکراہ پر مبنی ہو۔ اور جسے آئین و دستور شریعت و قانون سے کچھ سروکار نہ ہو"

اس اجمال کی مزید تفصیل وہ (Foundations of Leninism) میں دیتا ہے اور لکھتا ہے۔

"مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ ایسی انقلاب پسند اور صاحب اقتدار ہستی کا وجود ہے جس کی مطلق العنانی سرمایہ داری کی مکمل شکست و ریخت کے بعد لوگوں سے بجبر منوائی جائے گی"

دوسری جگہ خود لینن کے الفاظ نقل کر کے وہ لکھتا ہے۔

"مزدوروں کا ڈکٹیٹر جمہوریت کے انداز کی صاحب اقتدار ہستی نہ ہوگی جس کا انتخاب رائے عامہ سے عمل میں آتا ہے"

چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شروع شروع میں مزدوروں اور کسانوں کے مندوبین پر مشتمل ایک آئینی مجلس قائم ہوئی تھی لیکن ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو لینن نے اس مجلس کو کالعدم کر کے اپنے ڈکٹیٹر ہونے کا اعلان کر دیا۔

عملی حیثیت سے اگرچہ روس کی حکومت اپنے آپ کو اشتمالی جمہوریت (Socialist Republic) کہتی ہے لیکن درحقیقت وہاں اشتراکین کی جماعت اور اس جماعت کا ڈکٹیٹر ہی اصل حاکم ہے۔ اس جمہوریت میں جس انداز سے نمائندے منتخب ہوتے ہیں، اس کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک کسان نے کانگریس کے بھرے مجمع میں کہہ دیا تھا کہ رائے عامہ تو محض ایک کھلونا ہے اشتراکین اگر ہمیں مجبور کریں تو ہمیں ٹٹو کو نمائندہ بنا کر بھیجنا پڑ جاتا ہے۔

(Communism Exposed)

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ اشتراکیت کا موجودہ نظام حکومت شخصی اور بالکل ایسا ہی مطلق العنان ہے۔ جیسا شہنشاہیت کا نظام حکومت تھا (Religion—under the Soveit) کا مصنف لکھتا ہے کہ۔

"بالشوزم اپنی ڈکٹیٹرشپ کے ساتھ بلاشائبہ تشکیک شخصی حکومت ہے بلکہ قدیم نظام شخصیت

سے بھی زیادہ خود مختیار۔"

اسی کی تائید اشتراکیوں کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"سیاسی نظام حکومت میں جمہوریت کے طرزِ حکومت کو مسترد کر دیا جائے۔" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)۔

اور بفرضِ محال اگر کسی ملک کے سوشلسٹ جمہوری حکومت بھی قائم کرنا چاہیں تو اس کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو کی زبانی سنئے جو فرماتے ہیں کہ۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (میری کہانی ص۴۵۵)۔

اور اس حقیقت کا عملی ثبوت آپ کو آج کل کے کانگریسی صوبوں کے اندازِ حکومت سے بخوبی مل سکے گا۔ پھر جو حیثیت گاندھی جی کو دی جا رہی ہے۔ نگہِ حقیقت بین اس سے بھی اندازہ کر سکتی ہے کہ ہوا کا رُخ کس طرف کو ہے۔

ان اصول و مبادیات سے لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اشتراکیت کا نصب العین اور دستور اساسی حسب ذیل شقوں میں منقسم ہے۔

نظامِ معاشی:۔ ہر قسم کی شخصی اور انفرادی ملکیت خواہ وہ جائیداد کی شکل میں ہو یا سرمایہ کی، یکسر مٹا دی جائے۔ انفرادی کوششوں اور ذاتی محنتوں کے حاصل کو عوام کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا جائے۔ تاکہ جماعتی تفریق مٹ جائے اور مالی مساوات پیدا ہو جائے۔

نظامِ عائلی:۔ ازدواجی تعلقات پر سے تمام قیود اور پابندیاں اٹھا دی جائیں۔ عورت کو ہر مرد سے اختلاطِ جنسی کی مکمل آزادی ہو۔ بچے عوام کی ملکیت قرار دئے جائیں۔ اور اس طرح "نظام عائلی" کو کالعدم کر دیا جائے۔

نظامِ حکومت:۔ ہر قسم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو، اس وقت تک حکومت کے تمام اختلافات ایک قوتِ قاہرہ یعنی منزعن الخطاء۔ اور مطلق العنان

ڈکٹیٹر کو دے دئے جائیں۔

نظامِ مذہب:۔ خدا کی ہستی کا اعتقاد ذہن انسانی سے محو کر کے تمام مذاہب کا نام و نشان صفحۂ ارض سے مٹا دیا جائے۔ اور جب یہ ہو گیا تو عاقبت پر ایمان خود بخود ناپید ہو جائے گا۔

طریق کار:۔ ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جائز و ناجائز ہر حربہ استعمال کیا جائے۔ اور خون و آتش کی ہلاکت انگیزیوں سے لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس نظامِ زندگی کو اختیار کریں۔

یہ ہے مختصراً وہ سوشلزم جس کے متعلق ڈاکٹر اشرف صاحب کا ارشاد ہے کہ اس کے خلاف یہ "پروپیگنڈا" قطعاً لاعلمی پر مبنی ہے کہ "وہ خدا اور مذہب کے خلاف ہے۔ قدیم تمدن اور کلچر کے خلاف ہے۔ ضابطۂ اخلاق کے خلاف ہے۔ ازدواجی تعلقات کی حدود و قیود کے خلاف ہے۔ اس کے نظامِ حکومت میں جمہوریت نہیں۔ سوشلسٹ تشدد پسند ہوتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ ہم حیران ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو "قطعاً لاعلمی" پر مبنی سمجھیں یا دانستہ کتمانِ حقیقت پر۔ بہر حال سوشلزم کے بنیادی اصول آپ کے سامنے ہیں۔ اور ان کی ایک ایک شق سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کی اساد پر مبنی ہے۔ ان شقوں کو سامنے رکھکر اب ہم دیکھیں گے کہ سوشلزم کہاں تک اسلام کے موافق، یا مخالف ہے۔

اسلام

جس طرح اشتراکیت کے تعارف میں صرف ان ہی اصولوں کو معتبر سمجھا گیا ہے جو مدعیانِ تحریک کے نزدیک مستند ہیں اور اُن کے ماورا فروعات یا ذاتی قیاسات کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اسی طرح اسلامی تعلیم کو پیش کرتے وقت صرف قرآن کریم کی نصوص صریحہ اور سنت نبوی کی حکمت بالغہ کو ہی سامنے رکھا جائے گا۔

نظامِ معاشی | اشتراکیت ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن اسلام ہر شخص کی کمائی

اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے زمانۂ ظہورِ اسلام میں جائداد و املاک عموماً مویشیوں کی شکل میں تھیں۔ ان کے متعلق فرمایا۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۳۶-۷۱

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے اپنے دستِ قدرت سے مویشی پیدا کئے ہیں جن کے یہ لوگ مالک ہیں۔

جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں انسان کی ملکیت ہو سکتی ہیں تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات تو یقیناً اُس کی ملکیت ہوں گی۔ ارشاد ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ ۴-۳۲

جو مرد کماتے ہیں اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو عورتیں کماتی ہیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اشتراکیت کے اصول نفی املاک سے اسلام کا معاشی تمدنی اور عمرانی ہر قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ؕ ۱۷-۲۶

قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا۔ اور محتاج اور مسافر کو بھی۔ اور مال کو بے موقع فضول خرچی میں نہ اُڑانا۔

ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز کسی کی ملکیت ہو۔ اگر ہر چیز غیر کی ملکیت ہو اور کمانے والے کو صرف اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔

یہی حال ترکہ و وراثت کے احکام کا ہے جن پر ذاتی ملکیت کی عدم موجودگی میں عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ حکم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ ؕ ۴-۳۳

اور ہر ایسے مال کے لئے جسے والدین اور رشتہ دار لوگ چھوڑ دیں ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں اور جن لوگوں

سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں ان کو ان کا حصہ دیدو۔

دوسری جگہ ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ۔ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ۔ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ط ۔ ۷ ۔ ۴

مردوں کے لئے حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں وہ چیز تھوڑی ہو یا بہت حصہ قطعی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ وصیت، وراثت، ترکہ کے احکام اسی صورت میں نافذ العمل ہیں جب کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر مرے۔ اگر کوئی شخص ترکہ نہ چھوڑے تو ان احکام کا اطلاق نہیں ہوگا۔ پس اشتراکیت میں جب ترکہ ہی نہیں تو یہ احکام خود بخود ساقط ہو جائیں گے۔

بظاہر یہ اعتراض قوی نظر آتا ہے لیکن ادنےٰ تدبر سے اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ وراثت و ترکہ کے احکام اسی وقت نافذ ہوں گے جب کوئی ترکہ چھوڑ کر مرے لیکن "ترکہ نہ چھوڑنے" اور "ترکہ نہ چھوڑ سکنے" میں بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں جواز ہے اور دوسری میں جبر۔ قرآن حکیم کے اوامر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بجائے خویش مستحسن ہیں اور جس چیز کو قرآن نے حلال کیا ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے حرام نہیں بنا سکتی حتےٰ کہ یہ اختیار خود نبی ؐ کو بھی نہیں دیا گیا۔ حضور ؐ نے ایک قسم کے شہد نہ کھانے کی پابندی اپنے اوپر عائد کر لی۔ تو فوراً حکم آ گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۶۶/۱

اے نبی جس چیز کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اسے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو۔

یا مثلاً قرض لینے اور دینے کا معاملہ ہے ہو سکتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں ایسا وقت آجائے کہ کسی کو قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ یا کسی کے پاس قرض دینے ہی کو کچھ نہ ہو تو ان صورتوں میں اگرچہ قرضہ کے احکام ساقط العمل ہو جائیں گے لیکن دنیا کی کوئی طاقت ایسا قانون نہیں بنا سکتی جس کی رو سے قرآن کے تجویز فرمودہ قواعد لین دین کو اس طرح بدل دیا جائے کہ ایک مسلمان باوجود جائز ضرورت و احتیاج کے کسی سے کچھ قرض نہ لے سکے۔ یا

دوسرا مسلمان استطاعت واقتدار رکھتے ہوئے اپنے مسلمان بھائی کو قرضہ نہ دے سکے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے وجعلنا موالی ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں۔ اور مدعیانِ اشتراکیت کہتے ہیں کہ جنہیں اللہ وارث مقرر کرتا ہے۔ انہیں ہم ورثہ سے محروم کرتے ہیں۔ کیا کوئی مسلمان ایسے قانون کو برداشت کر سکتا ہے جو خدائی قانون کا ناسخ ہو ——؟

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور نصب العین حیات ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں ہر وقت ہر ایثار کے لئے تیار رہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے پہلے ورق میں انسانوں کی ان امتیازی خصوصیات کا ذکر ہے جن سے وہ صحیح اسلامی سوسائٹی کے افراد بن سکتے ہیں۔ یہ خصوصیتیں تین ہیں۔

(۱) اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ	ایمان بالغیب
(۲) ویقیمون الصلوٰۃ	عبادت بدنی (نماز)
(۳) ممّا رزقناھم ینفقون	انفاق فی سبیل اللہ

اور اصل نیکی کے متعلق فرمایا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط ۳-۹۲

تم نیکی کو نہیں پہونچ سکتے۔ یہاں تک کہ اپنی محبوب شے کو خرچ نہ کر دو۔

یہ ظاہر ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذاتی ملکیت تسلیم کی جائے۔ ورنہ جو چیز اپنی ملکیت ہی نہیں۔ اس میں سے انفاق کیسا؟ قرآن کریم نے فرمایا۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ گویا جو اللہ نے دیا ہے وہ انفرادی ملکیت ہے۔

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْ اٰتٰکُمْ۔ ۲۴-۳۳۔

اس مال میں سے ان کو (غلاموں کو) بھی دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ ۲-۲۶۷

اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز کو خرچ کیا کرو۔

مَا کَسَبْتُمْ سے مطلب ہی یہ ہے۔ کہ جو کچھ تم کماتے ہو۔ وہ تمہاری ملکیت ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط (۵۷-۷) جس مال کا تم کو (پہلوں سے منتقل کرکے) وارث بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اشتراکیت کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی کا سرمایہ۔ جائداد۔ کمائی۔ ورثہ سب کچھ حکومت لیلے تو یہ انفاق کی وہ حد ہے جس سے بڑھ کر قربانی اور ایثار کی مثال نہیں ہوسکتی لیکن اسلامی انفاق (جو تقوے پر مبنی ہے) اور اس قسم کے جبر میں بڑا فرق ہے۔ اسلام نے بھی ایک ٹیکس (زکوٰۃ) مقرر کیا ہے۔ جو بہرحال وصول کیا جاتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۹-۱۰۳

ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے۔ کہ اس سے یہ ظاہر و باطن میں پاک ہو جائیں گے۔ اور پھر ان کے لئے دعا کیجئے۔

لیکن ساتھ ہی اس نے خیرات کا بھی حکم دیا ہے جس میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲-۲۱۹)۔

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ کہدیجئے کہ جتنا آسان ہو۔

اس کے علاوہ جہاں دنیاوی قوانین سے محض قومی افادیت اور ملکی مفاد مقصود ہوتے ہیں۔ وہاں اسلامی انفاق میں ان مفاد کے ساتھ ساتھ تزکیہ قلوب و نفوس بھی پیش نظر ہے۔ ایک طرف قوم کے محتاج۔ مفلوک الحال افراد کی دستگیری مقصود ہے تو دوسری طرف معطی کے قلب کو حب مال کی خباثت سے پاک اور اس کی جگہ ایثار و قربانی کے جذبہ کی پرورش کرنا بھی مطلوب ہے۔ یہ دوسرا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان ارادہ و اختیار کے باوجود اپنی پاک کمائی اور جائز ملکیت میں سے بہ خوشی خرچ کرے۔ قرآن کریم نے اس فرق کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی کیفیت اس دانہ کی سی ہے۔ جس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال کے اندر سو دانے ہوں"۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ آزار بنتے ہیں ان کے (اعمال کا) ثواب ملے گا"

"مناسب بات کہدینا اور درگذر کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد آزار پہونچایا جائے اے ایمان والو احسان جتا کر یا آزار پہونچا کر اپنی خیرات کو برباد نہ کرو وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی حالت اس چکنے پتھر کی سی ہے جس پر کچھ مٹی پڑ گئی ہو۔ لیکن جسے زور کی بارش فوراً بہا لے جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی کا پھل ذرا بھی ہاتھ نہیں لگتا" "ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو خدا کی رضاجوئی کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اپنے نفسوں کو اس عمل شاقہ کا خوگر بنا کر اپنے اندر پختگی پیدا کرنا چاہتے ہیں اس باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلے پر واقع ہو اگر بارش زور کی پڑے تو وہ دوگنا چوگنا پھل لائے۔ اور اگر زور کا مینہ نہ برسے تو معمولی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے" (البقرہ رکوع ۳۶)۔

چنانچہ یہاں پر ریا کو بھی کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں مقصد پیش نظر مرضات اللہ ——— نہ تھا چہ جائیکہ جبر کو ایثار قرار دے دیا۔ اختیار و ارادہ کے ساتھ انفاق کی غرض اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ نفس کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر اس میں ایثار و ہمدردیٔ خلائق کی پختگی پیدا کر دی جائے۔ یہ چیز اشتراکیت کے جبر میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس بیان سے واضح ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد اسلام نے قائم کی ہے اشتراکیت اس کے بالکل منافی ہے اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ نظام معاشی ہماری اقتصادی مشکلات کا واحد حل ہے جبتک زکوٰۃ باقاعدہ بیت المال میں جمع ہوتی رہی اور اس کی تقسیم کا طریقہ درست رہا اس وقت تک اہل حاجت کی امداد اور قومی ضروریات میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ حالت ہو گئی کہ زکوٰۃ کا روپیہ بیت المال میں موجود ہے مگر کوئی لینے والا نہیں۔ صدقہ و خیرات کی تحریص کا نتیجہ تھا کہ اغنیاء محتاجوں کے گھروں پر جا جا کر روپیہ تقسیم کرتے تھے۔ اور قانون وراثت کی رو سے جائداد کی دوامی ملکیت کا امکان ہی جاتا رہا تھا جس کے ماتحت مسلم کی جائداد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، دور دور کے انسان اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور دولت کسی ایک طبقہ کے لوگوں میں محدود ہونے نہیں پاتی۔

مساوات

ادنیٰ و اعلیٰ۔ امیر و غریب۔ متمول و مفلس کے باہمی امتیازات کو مٹا کر مالی مساوات کے ذریعہ سے انسانوں کو ایک ہی سطح پر لے آنے کا اصول کچھ ایسا سحر کار واقعہ ہوا ہے کہ عوام تو ایک طرف بڑے بڑے مفکرین اس کی نظر بندی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور یہی اشتراکیت کا وہ اصول ہے جسے بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ عین اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اسلامی مساوات اور اشتراکی مساوات میں کیا فرق ہے۔ اشتراکیت کا تقاضا ہے کہ تمام انسانوں کی دولت اور اُن کی محنتوں کا حاصل عوام کی ملکیت قرار دے دیا جائے اور وہاں سے ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق کفاف مل جائے۔ تاکہ ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز اُٹھ جائے۔ اور سرمایہ دار اور مزدور میں جو حدِ فاصل ہے وہ خود بخود مٹ جائے۔ لیکن اسلام کی نظر میں مساوات انسانی کا تخیل صرف مالی مساوات سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے۔

اسلام نظام سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن اور غریب انسانوں کا دلی ہمدرد ہے۔ اسلام کے نزدیک نہ تو مال و دولت معیارِ فضیلت بن سکتے ہیں اور نہ حسب و نسب کے امتیازات۔ قرآن کریم نے معیارِ بزرگی یہ بتایا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ ۴۹/۱۳

اے ساکنان زمین ہم نے تم سب کو ایک (ہی نوع کے) مرد اور ایک ہی نوع کی عورت سے پیدا کیا ہے ہمارے نزدیک تم سب برابر ہو) اور تمہارے مختلف گروہ اور قبیلے محض اسلئے بنائے ہیں کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ورنہ اللہ کے نزدیک تم سب میں قابلِ عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ حقیقی عزت اور اصلی مفاخر دولت کی فراوانی اور سرمایہ کی کثرت میں نہیں ہے بلکہ دلوں کے تقویٰ اور اعمال کی صلاحیت میں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ انسان جب اس میدانِ مسابقت میں نمودار ہوئے۔ جن میں سے ایک ہابیل غریب لیکن خدا سے ڈرنے والا اور دوسرا قابیل امیر اور متکبر تھا تو اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی کو شرفِ قبولیت بخش کر یہ واضح کر دیا کہ خدا کے نزدیک معیارِ فضیلت تقویٰ ہے۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۵)

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ مال و دولت کے ساتھ اگر تقویٰ و خدا ترسی نہ ہو۔ اور وہ تکبر نخوت تمرد اور

سرکشی کا موجب بنجائے۔ تو ایسا مال انسان کو بہت جلد ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو قارون کا ذکر (۲۸/۷۹-۸۱) - اور ان دو شخصوں کا قصہ جن میں سے ایک کے دو باغ تھے اور دوسرا غریب تھا۔ (الکہف ع ۵ - ۳۲ تا ۴۵) -

لیکن جہاں قرآن کریم نے فضیلت و فوقیت کا معیار مال و دولت کی بجائے اعمال صالحہ اور حسن نیت کو قرار دیا ہے۔ اور دولت و حشمت سے جو تمرد اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مختلف عنوانوں سے مذمت کی ہے۔ وہاں اس نے دولت و ثروت کے اعتبار سے بنی نوع انسان میں مدارج کے اختلاف کو مقتضیات فطرت میں سے قرار دیا ہے اور کاروبار عالم کے چلانے کے لئے اس تفریق مدارج کو برقرار رکھنا وہ ضروری سمجھتا ہے۔ فرمایا

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا - ۴۳/۳۲

(ان کی دنیاوی زندگی کی روزی ہم تقسیم کرتے ہیں اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت اور فوقیت دے رکھی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

چونکہ اختلاف مدارج فطری امر تھا۔ اور اس کا قائم رکھنا ضروری تھا۔ اس لئے فرما دیا کہ اس تفریق کو دیکھ کر حسد نہ کیا کرو۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط ۴/۳۲

اور تم ایسے کسی امر کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اس تفریق مدارج کو پیدائشی یا پہلے جنم کے کرموں کا پھل نہیں بتایا بلکہ کسب و دولت کی قابلیت و استعداد کے اختلاف پر مبنی قرار دیا ہے اور فرمایا -

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۵۳ انسان کو وہی کچھ ملیگا جسکی اس نے کوشش کی ہو۔

دولت کی مساویانہ تقسیم کو اس نے خلاف فطرت قرار دیا ہے۔ اور اسے کفران نعمت بتایا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ

رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ ۱۶/۷۱

اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے۔ وہ اپنے مال کا حصہ اپنے غلاموں (اور نوکروں) کو اس طرح کبھی نہ دیں کہ مالک و مملوک سب آپس میں برابر ہو جائیں۔ کیا اس طرح اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

کیونکہ اختلافِ مدارج اعمال و مساعی کے مطابق ہوتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۴۶/۱۹ | اور ہر ایک کے مدارج اسکے اعمال کے مطابق ہیں۔

اختلافِ مدارج دنیاوی کاروبار کے لئے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ انسان کی عمرانی زندگی کا تقاضا ہے کہ تقسیمِ عمل ہو۔ اور چونکہ اعمال بہر حال ادنیٰ اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقسیمِ عمل کے اعتبار سے مدارج مختلفہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر خاص خاص قویٰ ودیعت کئے گئے ہیں۔ جن کو بروئے کار لانے کے لئے خاص خاص جذبات کو حرکت میں لانا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً قوتِ مدافعت کا مظاہرہ اُسی وقت ہوگا۔ جب غیرت و حمیّت یا دفع مضرت کا جذبہ حرکت میں آئیگا۔ یا مثلاً قوتِ استدلال کے جوہر صرف اُسی وقت کھلیں گے۔ جب جذبۂ خودداری پر ٹھیس لگے گی۔ اسی طرح کسب و ہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اس صورت میں رُونما ہونگے جب اُن کے لئے کوئی جذبہ یا کشش موجود ہوگی۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ اپنی محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ "میں" اور "میرا" ہی وہ "سم سم" ہے جس سے تمام مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اور ہر مشکل کا طلسمی باب خود بخود کھل جاتا ہے۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱:۳) | ہر بڑائی والے کو اس کی بڑائی دیجائیگی۔

کارگہِ حیات میں جتنی جدوجہد۔ جسقدر تگ و دو ہے سب اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ نبضِ حیات میں تموّج ہے تو اسی کے دم سے۔ اور نظامِ عالم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ ذہنِ انسانی سے یہ جذبہ نکل جائے تو ہنگاموں اور شورشوں کی بجائے سکوت دنیا راہبوں کی جھونپڑی

اور سنیاسیوں کی کٹیا بن جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مال و دولت کی فراوانی تکبر و غرور پیدا کر دیتی ہے جو انسانی استبداد و مظالم کا اصل الاصول ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک درد سر کا علاج سر کاٹنا نہیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بلکہ سر میں کیفیت اعتدال پیدا کر کے درد کو دور کرنا ہے۔ انسانی اعمال میں بڑی افراط اور تفریط ہے۔ اسے دور کر کے اعمال میں اعتدال پیدا کرنا اسلام کا کام ہے۔ مال و دولت کو معیارِ فضیلت قرار دینے سے سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اور مال و دولت پر لات مار کر جنگلوں کا رخ کرنے سے نظامِ کائنات درہم و برہم ہو جاتا ہے۔ اسلئے اسلام نے ایک طرف اس رہبانیت سے منع کیا۔ اور جد و جہد حیات میں مساعی و اعمال، مسابقت و مقابلہ کو اصل زندگی قرار دیا۔ اور دوسری طرف سرمایہ داری کے عواقب خبیثہ اور نتائج قبیحہ کے خلاف جہاد کیا۔ کہ مال و دولت کو عزّت و فضیلت کا معیار سمجھکر غریبوں کو کچلنا شروع نہ کر دیا جائے۔ فرمایا

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَالْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۱۷/۲۱

دیکھئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے لیکن آخرت بلحاظ مدارج اور باعتبار فضیلت بہت بڑی ہے۔

اور اختلافِ مدارج کو وجہِ ابتلاً بتایا۔

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۔ ۶/۱۶۶

اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر رفعت دی ہے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس میں تمہاری آزمائش ہو سکے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (المائدہ ع ۷) ۵/۴۸

اگر یہ مشیتِ خداوندی ہوتی تو تمام انسانوں کو ایک ہی جماعت بنا دیا جاتا (یہ اس لئے نہیں کیا کہ) جو کچھ تم کو دیا گیا ہے اُس میں آزمائے جا سکو۔ پس نیکی کرنے کے لئے مسابقت کرو۔

ایک شخص اپنی محنت و مساعی سے جو کچھ کماتا ہے۔ اسے اس کی واحد ملکیت قرار دیدیجئے۔ اور پھر

اسے ترغیب دیجئے کہ وہ برضا و رغبت اپنے اختیار و ارادہ سے اپنی کمائی سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے دیکھئے اس سے انسانیت کتنے قدم آگے بڑھتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دولت مند اور صاحب ثروت شخص جو اپنے آپ کو واجب التکریم سمجھتا ہے۔ کسی غریب اور مفلس انسان کی جو صاحب تقویٰ ہے خود بخود اسوجہ سے عزت کرتا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ تو غور فرمائیے کہ انسانیت کس درجہ فروغ پاتی ہے۔ لیکن اگر ارادہ اور اختیار کو انسان سے چھین لیا جائے تو انسانیت اور شرافت تباہ ہو جاتی ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ ۶۷

اللہ نے موت و حیات (انسانی) کو پیدا کیا تاکہ تم آزمائے جاؤ کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

یہی وہ ابتلا ہے جس سے انسانیت تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اشتراکیت کی جبری مساوات انسانی شرف اجتباء کی ترقی معکوس اور رجعتِ قہقری ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ۔ (والتین)

ہم نے انسان کو بہترین ہیئت کذائی میں بنایا۔ پھر اس کو ادنیٰ درجہ کی طرف لوٹا دیا۔

اسلامی مساوات کی درخشندہ مثالیں اس کے صدرِ اولیٰ میں ہر مقام پر نظر آتی ہیں۔ جن کے پیش کرنے سے اشتراکیت باوصف اپنے مزعومہ دعاوی مساوات۔ یکسر قاصر ہے۔ ایک حبشی غلام جسے خود حضرت ابوبکر صدیقؓ زرِ فدیہ دیکر آزاد کراتے ہیں کے شرفِ اجتباء کا یہ عالم ہے کہ جب وہ دور سے آتا دکھائی دیتا ہے تو عمرؓ اور ابوبکرؓ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ سیدنا بلال ہمارے آقا آرہے ہیں۔ اور بنی ہاشم کے ممتاز ترین قبیلہ کے ممتاز ترین رکن۔ مولائے علیؓ فرماتے بلال میرے اہل بیت میں سے ہے۔ روم کا ادنیٰ مزدور مدینہ میں آکر آزادی حاصل کرتا ہے اور حضرت عمرؓ اپنی آخری خواہش یہ فرماتے ہیں کہ "میرے جنازہ کی نماز صہیب رومی پڑھائیں"۔ خود رسول اللہؐ اپنے غلام زید بن ثابتؓ کے ساتھ بنی ہاشم کے خاندان کی خاتون محترمہ اپنی پھوپھی زاد بہن کا عقد فرما دیتے ہیں۔ اسی غلام کے بیٹے (اسامہ بن زیدؓ) کا اس

لشکر جرار کا سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا ہے جس میں ابو بکرؓ و عمرؓ۔ عثمانؓ و علیؓ جیسے قصر اسلامی کے ارکین اعلیٰ بحیثیت سپاہی کے کام کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں ہمیں یہ تصویریں بھی ملتی ہیں کہ خلیفۃ المسلمین جناب عمرؓ اس اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے پیدل چل رہے ہیں جس پر آپ کا غلام سوار ہے۔ یا ایک نومسلم نصرانی شاہزادے کی چادر پر طوافِ کعبہ کے دوران میں جب ایک غریب بدو کا پاؤں پڑ جاتا ہے تو شاہزادہ دنیاوی وجاہت کے گھمنڈ میں اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے۔ اور بدو اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ شاہزادہ دربار خلافت میں آکر شکایت کرتا ہے کہ ادنیٰ بدو نے ایک عالی وقار امیر کے طمانچے کا جواب طمانچے سے دیدیا۔ وہاں سے فیصلہ ہوتا ہے کہ شاہزادے نے چونکہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اس لئے اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ شہزادہ مساوات کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور کہتا ہے کہ شاہزادہ اور مزدور آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ جب کہا جاتا ہے کہ اسلام کی ترازو میں دونوں برابر ہیں۔ تو وہ اسلام چھوڑ کر پھر عیسائی ہو جاتا ہے۔ خلیفۃ المسلمین نے اس کا عیسائی ہونا برداشت کر لیا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ مساوات اسلامی کے بنیادی اصول پر کسی قسم کا حرف آئے۔ یہی وہ مساوات کی تعلیم تھی جو سردارانِ قریش کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی اور جس کی وجہ سے وہ اسلام کے دشمن بن گئے کیونکہ اس تعلیم کی رُو سے اُن کے تمام مدارج و مراتب ملیامیٹ ہوئے جاتے تھے۔ ابوجہل کائنات سے اپیل کرتا ہے کہ وہ محمد سے بدلہ لے۔ کیونکہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب!
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدر احرار عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دود مانے ریختند

(اقبالؒ)

اس دورِ سعید کے بعد جو انسانیت کے معراج کبریٰ کا عکس تھا۔ اسلام کے دورِ شاہنشاہیت میں بھی مساوات کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے مفکرین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ شاہزادہ

مراد کے لئے کسی معمار نے مسجد بنائی۔ شاہزادہ کو پسند نہ آئی۔ اور اس نے جوشِ غضب میں معمار کے ہاتھ کٹوا دئے۔ معمار نے قاضی کے ہاں انصاف چاہا۔ مراد مجرموں کے کٹہرے میں لایا گیا۔ اس نے اقرار جرم کیا۔ قاضی نے فیصلہ دیا کہ جس طرح معمار کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں اسی طرح شاہزادہ کے ہاتھ بھی کاٹ دئے جائیں کہ

عبدِ مومن کمتر از احرار نیست　　خون شہ رنگیں تر از معمار نیست
پیش قرآں بندہ و مولا یکے ست　　بوریا و مسندِ دیبا یکے ست (اقبالؒ)

شاہزادہ نے ہاتھ بڑھا دئے۔ مدعی کو تاب خاموشی نہ رہی اور پکار اٹھا کہ میں نے شہزادہ کا قصور معاف کیا۔ آج کل کے گئے گذرے زمانے میں بھی اسلامی مساوات کا نظارہ دیکھنا ہو تو کسی مسجد میں جماعت کے وقت چلے جائیے۔ جہاں انسانوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے　　تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ مثال بھی آپ کو صرف اسلام کی تاریخ میں ہی ملے گی کہ ہندوستان میں "غلاموں کا خاندان" اور مصر میں "مملوک" (غلام) صدیوں تک حکومت کرتے رہے۔ غلام ہو کر آقا اور مملوک ہو کر مالک بن جانا محض اسلام کے طفیل تھا۔

مالی تفوق کے اعتبار سے خود دور صحابہؓ میں مختلف طبقات موجود تھے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ کے کاروبار میں ایک ہزار مزدور روزانہ کام کیا کرتے تھے۔ حضرت طلحہؓ کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار دینار تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اُن کا قافلہ مدینہ میں آیا تو اس میں سات سو اونٹوں پر صرف اشیائے خوردنی لد رہی تھیں۔ لیکن مسلمانوں میں ان ہستیوں کا نام اگر آجتک سلام و صلوٰۃ کے ساتھ لیا جاتا ہے تو اس کی وجہ اُن کی دولت و ثروت نہیں بلکہ ان کا وہ ایمان۔ تقویٰ۔ اعمال صالحہ۔ ایثار۔ قربانی ہیں۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے اُنہوں نے نمونہ کے طور پر یادگار چھوڑا ہے۔ انہی متمول صحابہ کبار کے ساتھ ساتھ اصحاب صفہ جیسے مفلوک الحال حضرات کا نام بھی آجتک مسلمانوں کے لئے باعثِ افزائش ایمان و عمل ہے۔

اسلام نے مال کو خزائن و دفائن کی شکل میں زمین دوز کرنے سے منع کیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ....

.....تَكْنِزُونَ۔ (۹-۳۴-۵)

جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ آپ انہیں ایک بڑے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔ انہیں دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا۔ اور ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں، کردٹوں پشتوں کو داغا جائیگا۔ یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا۔ اب اپنے جمع کرنیکا مزہ چکھو۔

اور مال و دولت کے انتقال کی صورت اس نے باہمی رضامندی قرار دی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ۔

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ۔ لیکن اگر تجارت ہو یا باہمی رضامندی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن بیع و اشترا لین دین ہر معاملہ میں محتاجوں کے ساتھ احسان و مروت کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ ربوا کو حرام قرار دیکر قرضہ کے متعلق فرمایا۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (۲ : ۲۸۰)

اگر (مقروض) تنگدست ہو تو آسودگی تک اسے مہلت دیدو اور معاف کردو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل اعتنا ہے۔ اشتراکیت کے حامی سرمایہ داری کے خلاف یہ الزام عائد کرتے ہیں۔ کہ اس میں مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ لیکن کیا خود اشتراکیت اس الزام سے بری ہے؟ نظام اشتراکیت کے ماتحت یہ فیصلہ کہ مزدور کس قدر کام کرے حکومت کرتی ہے (اسکی تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی) مزدور کی محنت کا حاصل حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور مزدور

کی ضروریات کا تعین بھی حکومت ہی کرتی ہے جس کے مطابق اسے زرِکفاف ملتا ہے۔ کیا یہ ہر ہر قدم پر مزدور کی آزادی کو سلب کرنا نہیں ہے؟ فرض کرو ایک مزدور سے حکومت۔ اس قدر کام لیتی ہے جس کا معاوضہ قاعدے کے مطابق چار روپے روزانہ ہونا چاہیے لیکن اگر اس کی ضروریات کے لئے صرف ایک روپیہ روزانہ کافی سمجھا جاتا ہے تو باقی تین روپے روزانہ حکومت کے پاس چلے جاتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام میں جہاں تک مزدور کے معاوضہ کا تعلق ہے کچھ فرق نہیں رہتا کہا جاسکتا ہے کہ اشتراکی نظام کے ماتحت حکومت مزدوروں ہی کی اصلاح و بہبود پر بقایا تین روپے صرف کر دیتی ہے اور سرمایہ دار اسے اپنے ذاتی مصرف میں لاتا ہے۔ لیکن یہ خرچ کی نوعیت کا فرق ہے جہاں تک مزدور کا تعلق ہے دونوں اس کی کمائی کے غاصب ہیں۔ اگر مزدور اپنی مرضی سے اپنی کمائی کا کچھ حصہ کسی کے نام منتقل کردے تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کی محنت کا ما حاصل اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرلے۔ قرآن کریم اس قسم کے معاملہ کو غصب و ظلم قرار دیتا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّ زَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ ۸۳-۱-۳

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے کہ جب لوگوں سے ناپ کریں تو پورا پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر دیں تو کم دیں۔

اس ناپ تول کے اصول میں معاوضہ بالمثل کی تمام فروعات شامل ہیں۔ اور خسرانِ مبین ان لوگوں کے لئے ہے جو دوسرے سے محنت تو پوری پوری لیں لیکن معاوضہ کم دیں۔ قرآن کے نزدیک محنت کرنیوالا اپنے پورے معاوضہ کا حقدار ہوتا ہے جو اسے فوراً مل جانا چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "مزدور کو اس کی پوری پوری مزدوری دیدو قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو"

ضروریات کے تعین کے لئے اسلام نے حدود و شرائط مقرر کر دی ہیں جن سے اسراف و تبذیر کا امکان نہیں رہتا اس نے ہر انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی کمائی کے اندر اپنی ضروریات خود متعین کرے چنانچہ غلامی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہے کہ آزاد اپنی ضروریات کا تعین خود کرتا ہے۔ اور غلام

کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ ۔ ۱۶/۷۵

اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک تو غلام ہے پرائے بس میں وہ کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ اور دوسرا شخص ہے جسے ہم نے خوب روزی دی ہے اور وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح جی چاہے خرچ کرتا ہے) کیا یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں۔

مسلم اپنی مِلک کا مالک ہے اور اس کے حق ملکیت کو خدا کے سوا کوئی خرید نہیں سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط ۹ - ۱۱۱

بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت دی جائے گی۔

شبہ ہو سکتا ہے کہ جب اسلام میں مسلم کے جان و مال کو خدا نے خرید رکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ حق و صداقت کی حمایت و حفاظت میں اگر ضرورت آپڑے تو عبد مومن بلا تامل اپنی جان و مال کو قربانی کے لئے پیش کر دے گا۔ تو اگر اشتراکی حکومت مزدور کا مال لیکر مفاد عامہ میں صرف کرے تو عین اسلام کے مطابق ہو گا۔ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے اشتراکیت میں مزدور کی محنت کا حاصل حکومت زبردستی لے لیتی ہے اور مزدور کی مرضی کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن خدا اور بندے کا معاملہ کلیتہً بندہ کی خوشی پر مبنی ہے اگر بندہ خدا کی راہ میں کچھ دیتا ہے تو اپنی خوشی سے اور بدلے کی امید میں دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے انفاق فی سبیل اللہ کے لئے لفظ قرضہ استعمال کیا ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ ۔ (۶۴/۱۷)

اگر تم لوگ اللہ کو اچھی طرح (خلوص سے) قرضہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے بڑھاتا جائے گا۔

مسلم کا ایمان غیر متزلزل ایمان ہے۔ کہ دُنیوی زندگی کے بعد اُخروی زندگی ہے جو حقیقی دار المکافات ہے اگرچہ بعض ایسے ہیں جن کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے مثلاً اعمال صالحہ کے نتیجہ میں عزت و وقار کی حیات

طیبہ۔ اور اعمال بد کے بدلہ میں ذلت و رسوائیوں کی لعنتی زندگی مگر حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں یہ معاوضے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّالدَّارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرًا ۔ (۱۶-۳۰)

جن لوگوں نے نیک اعمال کئے ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بھی بہتری ہے اور آخرت تو کہیں بہتر ہے

اشتراکیت میں غریب مزدور کو محنت کا ثمرہ نہیں ملتا۔ اور چونکہ وہ بعد کی کسی زندگی کا قائل نہیں ہے اس لئے اس سودے میں اسے صرف دینا ہی دینا ہے۔ معاوضہ کچھ نہیں ملتا۔ اگر رضا و رغبت کو مقدم رکھا اور ہر شخص اپنی محنت کی پیداوار کا خود مالک ہو اور ساتھ ہی آخرت پر بھی ایمان۔ تو انفاق اسلامی انفاق ہوتا ہے۔ ورنہ اشتراکیت میں تو خسرۃ الدنیا والآخرۃ اور خالص غلامی کے سوا کچھ نہیں۔

معاشی نظام کی طرح اشتراکیت کے معاشرتی نظام کو بھی جس کی رو سے صرف مالی مساوات قائم ہوتی ہے اسلام کے قانون مساوات سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ وہ قرآن کی نصوص صریحہ اور واضح، اور بین تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا جو شخص اس نظام کی ظاہری مساوات سے متاثر ہو کر اسے "عین اسلام" کہتا ہے یا خوش ہوتا ہے کہ روس اسلام کے قریب آرہا ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان چونکہ بالعموم اپنی تعلیم سے بیگانہ ہیں۔ اور اُن کے اعمال کو قرآن سے کوئی نسبت نہیں اس لئے جونہی انہوں نے اشتراکیت میں مساوات کا ذکر سنا (اور دُنیا عدم مساوات سے گھبرا چکی ہے) تو انہوں نے سمجھا کہ یہ مساوات ہی جملہ آلام کا علاج ہے اور اسے عین اسلامی تعلیم قرار دیدیا حالانکہ حقیقی مساوات جس کی دنیا کو تلاش ہے اسلامی مساوات ہی ہے۔ اور اشتراکیت کی مساوات قرآنی تعلیم کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت ابوذرؓ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اغنیا کی دولت کو غربا کا حق سمجھتے تھے۔ گویا اُن کے خیال میں اشتراکیت کی ایک جھلک پائی جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ (خلیفۂ ثالث) کو جب یہ معلوم ہوا۔ تو اُنہوں نے اُن کو فوراً زبدہ میں بھیج دیا جو ایک بیابان مقام تھا تاکہ تنہائی کی زندگی بسر کریں۔ حضرت ابوذرؓ نے وہیں وفات پائی۔

نظامِ عائلی (ازدواجی زندگی)

معاشرتی اور معاشی نظام کے ماتحت عائلی نظام کا ذکر ضمناً آچکا ہے اس باب میں عائلی نظام کے ایک اہم پہلو یعنی ازدواجی نظام کے متعلق مزید تصریح مقصود ہے۔ اشتراکیت میں مرد و عورت کے جنسی اختلاط کے متعلق کوئی حدود مقرر نہیں۔ نہ وہاں نکاح ہے نہ طلاق۔ نہ حرام و حلال اور نہ جائز و ناجائز میں تمیز۔ اسلامی تمدن اور شرعی نظام میں ازدواجی تعلقات کے ضبط و انضباط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دنیا نے عورت کے معاملہ میں بھی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ نے عورت کو محض جذباتِ شہوانیہ کا آلۂ کار سمجھا چنانچہ یونان کی ابیقوریت میں عورت کا تخیل کچھ ایسا ہی تھا۔ ایران میں مزدک کے فلسفۂ اشتراکیت کی رو سے عورت سوسائٹی کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ ظہورِ اسلام سے پیشتر عرب میں بھی عام سوسائٹی کا قریب قریب وہی نقشہ تھا جو آج روس کی اشتراکیت میں پایا جاتا ہے چنانچہ جب کئی مرد ایک عورت سے اختلاط کرتے اور بچہ پیدا ہوتا تو اس کی صورت جس مرد سے ملتی اسی کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔ اسے نکاح "بغایا" کہتے تھے۔ اسی طرح جب دس سے کم مرد ایک عورت سے بیک وقت جنسی تعلقات پیدا کرتے اور بچہ پیدا ہوتا تو عورت جس مرد کی طرف چاہتی بچہ کی نسبت کر دیتی تھی اسے نکاح "رجم" کہتے تھے (اشتراکیت ایسی صورت میں تمام مردوں پر بچے کی کفالت مساویانہ عاید کرتی ہے) نکاح کی ایک شکل "متاع" بھی تھی جس کی رو سے مرد و عورت باہمی اختلاط کا معاہدہ کر لیتے تھے اور اجورِ معینہ کے سوائے مرد پر کوئی اور ذمہ داری عاید نہیں ہوتی تھی۔

ان معاہدوں کے علاوہ فحش کاری کی داستانیں اتنی عام تھیں کہ شعرا انہیں فخریہ اپنے اشعار میں بیان کرتے تھے۔

اسلام نے ان فواحش کو دیگر خبائث کے ساتھ ظھر الفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں فساد ہی فساد برپا تھا) سے تعبیر کیا مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق نہایت واضح اور تاکیدی احکام صادر فرمائے اس نے مرد و عورت کے اختلاطِ جنسی کا صرف ایک طریقہ جائز قرار دیا جسے نکاح کہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور تمام طریقے حرام اور ناجائز قرار دئے۔ فرمایا۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ - (۳-۴)

عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہو۔ اس سے نکاح کرو (بجز محرمات کے)

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِىْٓ اَخْدَانٍ - (۵ - ۵)

(صرف) اس طریق پر کہ انہیں بیوی بنا کر رکھو۔ نہ کہ اعلانیہ بدکاری کرو یا خفیہ آشنائی رکھو۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ - (۲۴-۳۲)

اور جو تم میں بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ط ۱۷۔

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بری راہ۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ ؕ نیز ۷/۳۳

کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو۔ ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی اور جو پوشیدہ ہیں

وہ بھی اور ہر گناہ کی بات۔

نکاح کی غرض وغایت جذباتِ شہوانیہ کا فرو کرنا قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس سے مقصود بقائے نسل انسانی اور خانگی زندگی کا سکون وراحت بتایا ہے۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا يَّذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ط ۴۲/۱۱

اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے (جن کے ذریعہ سے تمہاری نسل کو پھیلاتا رہے)۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط (۳۰-۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ ان کے ذریعہ سے آرام وسکون ملے اور تم میں باہمی محبت اور جذبۂ رافت پیدا کیا۔

نکاح کو قرآن کریم نے معاہدہ قرار دیا ہے اسے عمر قید نہیں بتایا جس کے بندھن مقدرات انسانی کی طرح اٹل اور جنم لیکھے کی طرح انمٹ ہوں۔ فرمایا۔

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۴-۲۱)

اور تم ان عورتوں کا مہر کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم اُن سے بے حجابانہ مل چکے ہو۔ اور تم ان کے ساتھ بہت پختہ معاہدہ کر چکے ہو۔

زویمر نے اپنی کتاب (Across the world of Islam,) کے صفحہ ۱۰۸ پر لکھا ہے کہ اسلامی نکاح ایک معاہدہ ہے (Sacrament) نہیں ہے اس معاہدے کی شرائط مقرر کی گئی ہیں جن کی رُو سے مرد کے ذمہ مہر واجب ہوتا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ط ۴-۴ | اپنی بیویوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

اور وہ عورت کی ضروریات کا کفیل اور بوجہ صنف نازک ہونے کے اس کا محافظ ہوتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط ۴-۳۴

مرد عورتوں کے محافظ ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک (جنس) کو دوسری پر (مختلف چیزوں میں) فضیلت دی ہے۔ اور اس سبب سے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

عورت کی طرف سے علاوہ اس سکون و راحت کی زندگی مہیا کرنے کے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مرد کی عزت و آبرو کا تحفظ ضروری ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط (۴-۳۴)

نیک بخت عورتیں اطاعت شعار ہیں اور مرد کی عدم موجودگی میں اس چیز کی حفاظت کرتی ہیں جس کی حفاظت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

نکاح کے معاہدہ میں جبر و اکراہ نہیں۔ عورت کی رضامندی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہوتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (۴-۱۹)

اے ایمان والو تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔

اس معاہدہ کے دوران میں بیوی سے حُسن سلوک اور معاشرتِ حسنہ کی تاکید ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ | اوران عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کرو

اس معاہدے میں عورت کو وہی حقوق دیئے ہیں جو مرد کے ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲-۲۲۸)۔

اور عورتوں کے حقوق (مردوں کے ذمے) ایسے ہی ہیں جیسے (مردوں کے حقوق) عورتوں کے ذمے ہیں۔

اگر میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اور اختلافِ مزاج یا دیگر حالات کی وجہ سے وہ سکون و راحت مفقود ہو جائے جو اس معاہدہ کی اصل غرض تھی۔ اور گھر اضطراب و عدم اعتماد کا جہنم بن جائے۔ تو اس صورتِ حالات کے لئے بھی اسلام نے احکام نافذ فرما دئے ہیں۔ پہلے مختلف تدابیر سے معاملات سُلجھانے کی تاکید کی ہے۔ لیکن اگر تمام تدابیر و مساعی کارگر نہوں اور اختلافات ایسی بھیانک اور لاینحل شکل اختیار کرلیں کہ اصلاح ناممکن ہو جائے تو ایسی صورت میں نکاح کے معاہدے کو فسخ کر دینے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ایسی قیود و شرائط کے ساتھ کہ پہلے مکمل انقطاع سے پہلے بھی نوے فیصدی اتصال و ائتلاف کا امکان باقی رہے۔ لیکن جب مکمل انقطاع بھی ناگزیر ہو جائے تو ایک دوسرے کے حقوق کی انتہائی نگہداشت کی گئی ہے۔ یہ احکام سورۂ بقر، سورۂ نسآء اور سورۂ طلاق میں تفصیل سے درج ہیں۔ معاہدہ کے فسخ کرنے کے لئے جیسے مرد کے لئے ادائیگی مہر کا فدیہ مقرر کیا ہے ویسے ہی عورت کو بھی فدیہ ادا کر کے طلاق حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (۲-۲۲۹)۔

اس مال کے لینے دینے میں عورت مرد کسی پر گناہ نہ ہوگا جسے ادا کر کے عورت آزادی حاصل کرنا چاہے۔

طلاق کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنے کی مرد و عورت دونوں کو اجازت ہے۔ مگر عورت کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑتا ہے جسے عدت کہتے ہیں تاکہ ممکن ہے کہ اس تجرد کی زندگی سے اصلاح کا مادہ پیدا ہو جائے۔ نیز یہ کہ اگر وہ حاملہ ہے تو دوسرے نکاح سے قبل نتیجۂ حمل ظاہر ہو جائے (سورۂ بقر رکوع ۳۸)

اشتراکیت میں نہ نکاح ہے۔ نہ محرمات[1] کی کوئی قید۔ نہ طلاق کے لئے کوئی حدود و شرائط۔

---

[1] قرآن کی رُو سے وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے اُن کی تفصیل سورہ النساء اخیر پارہ ۴ ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۲ منہ

نہ عدت کا وجود، نہ زنا سے پرہیز۔ نہ فواحش سے احتراز۔ پس اسلام سے لے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا ممکن ہے کہ تجدد پسند طبقہ یہ کہے کہ جب بالغ مرد و عورت باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط پیدا کریں تو اسے بہر حال معاہدہ ہی سمجھنا چاہئے لیکن مذہب کو چھوڑ کر خود دنیاوی قوانین اور سماجی قواعد کی نظر میں بھی مرد و عورت کی یہ باہمی رضامندی جب تک قانونی قول و قرار کی شکل اختیار نہ کرے معاہدہ تسلیم نہیں کی جاتی۔ خود روس کی موجودہ اشتراکی حکومت میں اگرچہ رجسٹری اور غیر رجسٹری شدہ شادیوں کے بچوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا لیکن باہمی اختلاط کو مستند قرار دینے کے لئے اقرار و معاہدہ کی رجسٹری ضروری ہے بالغ مرد و عورت کا جنسی اختلاط جو نکاح کے بغیر ہو۔ قرآن کی نگاہ میں زنا ہے۔ فرمایا۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ ۔ (۲۴-۲)۔

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد۔ ان میں سے ہر ایک کے سو سو درے لگاؤ۔

گویا زنا ایک شرعی جرم ہے جس سے حد شرعی لازم آجاتی ہے۔ چونکہ اس میں زانیہ کو بھی سزا دینے کا حکم ہے اس لئے یہ حکم زنا بالجبر سے متعلق نہیں بلکہ باہمی رضامندی کے اختلاط سے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے کہ جب عورتیں اسلام لانے کے لئے آئیں تو ان سے منجملہ دیگر امور کے یہ بھی اقرار لیا کرو کہ وَلَا یَزْنِیْنَ ۶۰-۱۲ -(وہ بدکاری نہیں کریں گی) یہ اس لئے کہ ایام جاہلیت میں بدکاری عام تھی اور اسے روکنا ضروری تھا۔ ان ہر دو احکام میں بالغ مرد و عورت کی باہمی رضامندی سے بلا نکاح مباشرت کا نام زنا رکھا گیا ہے۔

ازدواجی زندگی کے اثرات یعنی عائلی نظام میں اشتراکیت کی رو سے۔ (۱) اسقاط حمل یعنی قتل اولاد قانوناً جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہے (۲) اولاد ماں باپ کی نہیں ہوتی، بلکہ حکومت (عوام) کی ملکیت ہوتی ہے (۳) حسب و نسب کا کوئی رشتہ اور خون کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ان ہر سہ امور میں قرآن کریم کا فیصلہ حسب ذیل ہے۔

(۱) قتل اولاد کے متعلق فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (الانعام) | اپنی اولاد کو افلاس کے سبب سے قتل نہ کرو۔

من املاق (افلاس کے ڈر سے) کے یہ معنی نہیں ہیں کہ افلاس کے علاوہ اور اسباب کے ماتحت قتل اولاد جائز ہے قتل اولاد بہرحال حرام وممنوع ہے لیکن من املاق کا ذکر اس وجہ سے کر دیا ہے کہ نزول حکم کے وقت سوسائٹی میں یہ شکل بالعموم رائج تھی۔ اس کی مثال قرآن کریم ہی میں ہے

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (البقر)

پس فحش باتیں کرنا، گناہ کرنا، آپس میں جھگڑنا حج میں منع ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فحش باتیں کرنا، آپس میں جھگڑنا، اور فسق وفجور میں مبتلا ہونا صرف حج کے ایام میں ممنوع، حج کے علاوہ دیگر ایام میں حلال وجائز ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ افعال شنیعہ ناجائز تو بہرحال ہیں لیکن ایام حج میں بالخصوص ان سے محترز رہنا چاہئے اور اس وضاحت کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں حج میں ایسی حیا سوز حرکات عمل میں آتی تھیں، جو اس فریضۂ مقدس کی حرمت وتکریم کے سراسر منافی تھیں۔

یہی صورت قتل اولاد کے متعلق ہے حضور صلعم جب عورتوں سے اسلام کی بیعت لیتے تھے تو اس میں یہ اقرار بھی شامل تھا۔

لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (۶۰-۱۲)۔ | کہ وہ اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گی۔

دوسری جگہ قرآن میں ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (انعام ۶-۱۴۱)۔

بڑے نقصان میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو محض بلا کسی سند ودلیل کے حماقت سے قتل کر دیا

اسلامی قانون کی رو سے اسقاط حمل قتل اولاد میں داخل ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت میں یہ جرم ہے

(۲) قرآن کی رو سے اولاد ماں باپ کی وارث ہوتی ہے اور والدین کے ذمہ اولاد کے بہت سے حقوق وفرائض عائد کئے گئے ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِی اَولَادِکُم (النساء) ۔ | اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے

اور اس کے بعد اُن تفصیلات کا ذکر ہے جن کی رو سے جائیداد کی تقسیم وغیرہ عمل میں آتی ہے علاوہ بریں اولاد کی تربیت و پرورش کے متعلق کتاب و سنت میں مبسوط و مفصل احکام موجود ہیں۔ جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں اگر اولاد کو عوام کی ملکیت تسلیم کر لیا جائے تو ان احکام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۳) نسبی رشتہ داروں کا ذکر معاشی اور معاشرتی نظام کے سلسلہ میں احکامِ وراثت کے ماتحت آچکا ہے۔ والدین کے ساتھ احسان و مروّت کی تاکید قرآن کریم میں بار بار آئی ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اور وَلَا تَقُل لَّھُمَا اُفٍّ (ان دونوں کو جھڑکی بھی نہ دو) قرآن کریم نے نسبی قرابت کو عائلی نظام کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔

ھُوَ الَّذِی خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّصِهْرًا ط (۲۵-۵۴)۔

اللہ وہ ہے جس نے پانی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا کیا۔ اور (اس تعلق کے ذریعہ) اس کو خاندان والا اور نسب و قرابت والا بنایا۔

مذکورہ بالا نصوص صریحہ سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کریم نے عورت کی حیثیت کو کس قدر بلند کر دیا ہے وہی عورت جس میں ادیانِ سابقہ اور عام سوسائٹی کے فیصلہ کے مطابق رُوح بھی نہیں تھی۔ اسے اسلام نے مردوں کے ہمدوش کھڑا کر دیا۔ اور سوائے ان اختلافات کے جو مرد و عورت میں تخلیق کیوجہ سے ہیں۔ کوئی فضیلت اور فوقیت ایک کو دوسرے پر نہیں رہی۔ عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ بیٹی۔ بیوی۔ ماں اور مبدع سوسائٹی اور ان چاروں حیثیتوں میں اسلام نے عورت کے حقوق کی زبردست نگہداشت کی ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے ترکہ میں اس کو حصہ دیا ہے۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید ہے وراثت میں اس کا حصہ ہے اور ازدواجی معاہدے میں اسے مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ جن کی نگہداشت فریقین کے ذمّے نکاح کے ذریعہ فرض کی جاتی ہے۔ بحیثیت ماں اس سے حسن سلوک اور احسان و مروّت کا حکم ہے بحیثیت مبدع سوسائٹی مردوں

کو اس کے ناموس کا ذمہ دار بنایا۔ اور اس کی عفت و عصمت کو اس قدر گراں بہا بتایا کہ کسی کو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ فرمایا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْنَ مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴-۳۰)

مسلمان مردوں سے کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔

اور عورتوں سے بھی کہدیا کہ دوسروں سے آنکھیں دو چار کر کے انہیں اذنِ تماشا نہ دیں کیونکہ ان کا جوہر بے بہا ہے جس کی غارت گری کی جرائتیں اکثر انہیں راستوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ

اور مسلمان عورتوں سے بھی کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔

اللہ اکبر! کہاں یہ احکام اور کہاں اشتراکیت کی شتر بے مہاری جس میں عورت عام سوسائٹی کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

نظامِ حکومت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اشتراکیت کا مقصد دنیا سے ہر قسم کے نظام حکومت کو فنا کر دینا ہے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا وہ حکومت ایسے مطلق العنان ڈکٹیٹر کے ذریعہ سرانجام دینا چاہتی ہے۔ جس کے اختیارات غیر محدود۔ اور جس کا حکم قانون ہو جو خود کسی قانون کا پابند نہ ہو اور جس کے انتخاب کے لئے رائے عامہ کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ نظام حکومت کس طرح وجود میں آیا شکار اور گلہ بانی کی منفردہ زندگی کے بعد جب انسان نے قبائلی اور مدنی زندگی اختیار کی تو ضروری ہوا کہ فرد کی آزادی اور اختیار و ارادہ کو محدود کیا جائے۔ کیونکہ باہمی تعاون کی زندگی میں فرد کے اعمال و افعال کا اثر خود اس کی ذات تک محدود رہنے کی بجائے دوسروں تک متعدی ہوتا ہے۔ اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی ضرورت لازمی ہو جاتی ہے ساتھ ہی ایک ایسی قوت

کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اِن قواعد متعینہ کو نافذ کر سکے۔ اس نظامِ حکومت کی ابتدا تو سیدھی سادھی تھی۔ لیکن نگرانِ کار جماعت کے افراد نے محسوس کیا کہ درندوں کے شکار اور چوپایوں کی سیاقت میں وہ ذہنی تعیش نہیں جو خود انسان کے شکار اور جماعت کی قیادت میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے رفتہ رفتہ ایسے قوانین کی طرح ڈالی جن سے برسرِ اقتدار جماعت کے ہاتھ مضبوط رہیں۔ مصر کے فراعنہ بطور دیوتاؤں کے پوجے جاتے تھے۔ بابل کے نمرود کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ ہندوستان کے راجہ ایشور پرماتما کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ رومۃ الکبریٰ کا اسقف خدا کے بیٹے کا قائمقام تھا فارس کے کسریٰ اپنے آپ کو ظل اللہ سمجھتے تھے۔ غرض ہر جگہ اسی جذبہ حکمرانی کے کرشمے مختلف اشکال و صور میں ظاہر ہوتے تھے

یک چراغیست کزوا نجمنے ساختہ اند

گذشتہ صدی تک یہ شخصی استبداد شاہنشاہیت کی صورت میں مختلف اقوام عالم میں بالعموم کارفرما تھا تغیر پسندی کے جذبے نے اس بساط کو اُلٹا اور انقلاب فرانس نے یورپ میں جمہوری یا قومی طرزِ حکومت کی بنا ڈالی۔ جس میں نظامِ حکومت قومی نمائندوں کی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مجلس کے فیصلے کثرت آراء ہوتے ہیں یہ مجلس جو قوانین وضع کرتی ہے ان کا مرافعہ نہیں ہو سکتا اس نئے نظامِ حکومت کو جو ذہن انسانی کی ہے اس وقت تک بہترین پیداوار ہے۔ رفتہ رفتہ تمام قوموں نے قبول کر لیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ شخصی مطلق العنانی کے مقابلہ میں یہ طرزِ حکومت بہت بڑی اصلاح ہے۔ لیکن

بنی نوع انسان کے دنیاوی مفکرین کے مقابلہ میں عرب کے امیؐ نے جو نظام بخشا وہ انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھنے اور اُن کی تمدنی و عمرانی زندگی کے تحفظ کے لیے بہترین دستور ہے۔ اساس و اصول کے لحاظ سے خدا کی کتاب مسلمانوں کے لئے قانون ہے۔ یہ اس خدا کا فرمان ہے جو رب العلمین ہے جس کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں جو نہ کسی کی رو رعایت کرتا ہے۔ اور نہ کسی کے ساتھ ذرہ برابر ظلم کرتا ہے وہ بحیثیت خالق ہونے کے بہترین طور پر جانتا ہے کہ نظم و نسق عالم کے لئے کس قسم کے قوانین کی ضرورت ہے۔ خدا کی کتاب کہتی ہے کہ۔

اِنِ الحکم الّا للہ (یوسف) | حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔

یہ وہ ضابطہ ہے جو شریعتِ الٰہی کی شکل میں دنیا کو ملا جس کے اساسی احکام اٹل اور جس کے اصول ناقابلِ تغیر ہیں۔ اسلام کا طرزِ حکومت اور تمدن و معاشرت تمام تر اسی ضابطہ پر مبنی ہے اس ضابطہ کے نافذ کرنے کے لئے ایک رئیس ملت کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے جس کی حیثیت اشتراکیت کے ڈکٹیٹر کی طرح واضع قوانین کی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوانین کا محض نگراں و پاسباں ہوتا ہے۔ اور جہاں تک قوانین کے اطلاق کا تعلق ہے اس میں اور ایک عام مسلمان میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا وہ مقامی اور وقتی معاملات کا حل کتاب اللہ کی روشنی میں مشاورت سے کرتا ہے اور فرعی وجزوی احکامات کی تدوین کے لئے وہ ایک جماعت مقرر کرتا ہے جو قرآن کو سامنے رکھکر احکامات منضبط کرتی ہے اور جسے فقہا کی جماعت کہا جاتا ہے ایک عام مسلمان ہو یا فقہا کی جماعت کا رکن مجلس مشاورت کا ممبر ہو یا خود رئیس قوم (امیر المومنین) سب پر یہ قوانین یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ اسلام کے قانون کے مہمات اصول خود اس احکم الحاکمین کے وضع فرمودہ ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے وہی قانون قابل تسلیم ہوگا جو شریعت الٰہی کے مخالف نہ ہو۔

اسلامی طرزِ حکومت کا یہ خاکہ صرف نظریہ ہی نہیں بلکہ دنیا اس کو عملی شکل میں خلافت راشدہ کے زمانے میں دیکھ چکی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر نظامِ حکومت نہ کبھی وجود میں آیا اور نہ آسکتا ہے خلفا قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے تھے وہ مہاجر و انصار سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً مشورہ کرتے تھے۔ کیونکہ قرآن کا حکم تھا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳-۵۳) | اور حکومت میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کرو۔

اور۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲-۳۶) | ان کی حکومت باہمی مشورے سے ہے۔

ان کے زمانے میں قانون کی نگاہ میں ادنیٰ و اعلیٰ غریب و امیر سرمایہ دار و مزدور میں کوئی فرق نہ تھا حضور ؐ نے فرمایا۔

لَيْسَ لِاَحَدٍ عَلٰى اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِيْنٍ اَوْ تَقْوٰى (مشکوٰۃ)۔

ایک کو دوسرے پر سوائے دین اور تقوے کے اور کوئی حق فضیلت و ترجیح نہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ اور اُبَیّ بن کعبؓ کا کوئی مختلف فیہ معاملہ جب حضرت زید بن ثابتؓ کی عدالت میں پیش ہوا اور حضرت زیدؓ نے خلیفۃ المسلمین کو دیکھ کر تعظیم کے لئے جگہ خالی کر دینی چاہی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے زید یہ پہلی ناانصافی ہے جو اس مقدمہ میں تم کر رہے ہو۔ (کتاب الخراج)۔

اسی طرح حضرت امیرؓ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے گئے تو مدعی کے برابر کھڑے رہے۔ (عقد الفرید)۔

خود خلیفۃ المسلمین کے منصب کا اندازہ اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمائی۔

لوگو! میں تمہارا امیر مقرر ہوا ہوں۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ بھائیو! میں تو صرف (شریعت الٰہی کی) اتباع کرنے والا ہوں کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں اگر میں درست کام کروں تو میری معاونت کرو۔ اور اگر میں کج ہو جاؤں۔ تو مجھے سیدھا کرو۔ (ابن سعد جلد ۳)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ایک مجلس میں جہاں باہمی اختلاف رائے تھا فرمایا

میں بھی تم میں سے ایک کے برابر ہوں (كَاَحَدِكُمْ) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جو میں چاہوں تم اس کی اتباع کرو۔ (کتاب الخراج)۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

لَا خِلَافَةَ اِلَّا عَنْ مَشُوْرَةٍ۔ (کنز العمال)۔

خلافت صرف عام مشورہ سے ہے۔

جس سے ظاہر ہے کہ خلافت و امارت نہ تو وراثت میں مل سکتی ہے نہ طاقت سے بجبر منوائی جا سکتی ہے۔ خلافت اسلامیہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ایک امانت ہے جو رائے عامہ سے

صاحب الامر کو تفویض کی جاتی ہے۔ چنانچہ بنی امیہ کی ملوکیت میں جب سلیمان نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ چونکہ میں رائے عامہ سے خلیفہ منتخب نہیں ہوا ہوں اس لئے میں خلیفہ برحق نہیں ہو سکتا۔

تصریحات مذکورہ سے واضح ہے کہ۔

(۱) اسلام میں حکومت کا قائم رہنا ضروری ہے اور یہ حکومت قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ لیکن اشتراکیت حکومت کے وجود کو ہی فنا کر دینے کے درپے ہے۔

(۲) اسلام میں حکومت شریعتِ الٰہی کے ماتحت ہوگی۔ لیکن اشتراکین خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔

(۳) اسلام میں قوانین واحکام کی حفاظت ونگہبانی کے لئے امیر ملت رائے عامہ سے منتخب ہوتا ہے..... لیکن اشتراکیت کا ڈکٹیٹر رائے عامہ کا محتاج نہیں ہوتا۔

(۴) اسلام میں مقامی اور وقتی ضروریات کے حل اور فرعی وجزوی مسائل کے استنباط کے لئے مجالس مشاورت ہوتی ہیں۔ گویا انتخاب ومشاورت میں جمہوری طرز اختیار کیا گیا ہے۔ نہ کہ شخصی ..... لیکن اشتراکیت کی ڈکٹیٹرشپ میں جمہوریت کا وجود ہی نہیں۔

(۵) اسلامی قانون کی نگاہ میں عام مسلمان اور صاحبانِ امر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے ہر ایک مسئول اور قانون کا پابند ہوتا ہے..... لیکن اشتراکی ڈکٹیٹر پر کسی قانون کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔

(۶) مسلمانوں کے مقدمات شریعتِ محمدی کے ماتحت فیصل ہوتے ہیں..... لیکن اشتراکین کے نزدیک شریعت مہمل شے ہے۔

اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظامِ حکومت کی کوئی شق بھی اسلامی نہیں کہلائی جا سکتی۔

مذہبی نظام اشتراکیت کا اوّلین اصُول مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہے اس کے نزدیک خدا اور آخرت کی زندگی پر ایمان بنی نوع انسان کی تمام مصیبتوں کا باعث ہے۔ گویا جب تک یہ اعتقادات ذہن انسانی سے حرف غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے جائیں گے دُنیا کو اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ پس جس تحریک کا نصب العین ہی تمام ادیان کو جس میں اسلام بھی شامل ہے دنیا سے نیست و نابود کرنا ہو۔ اسے عین اسلام کہنا اگر پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے مسلمان کا وجود دنیا میں مذہب کے نام سے ہے اگر مذہب نہیں تو مسلمان نہیں۔ مسلمان کی عبادتیں اور قربانیاں اس کا مرنا اور جینا صرف اس ذات کے لئے ہیں جسے خدا کہتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶-۱۶۳)۔

کہہ دیجئے کہ میری عبادتیں اور میری قربانیاں میرا مرنا میرا جینا صرف رب العالمین کے لئے ہے مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور (اس اعتقاد کی بدولت) میں سب سے پہلے مسلمان ہوں۔

بقول علامہ اقبال۔ ع ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

خدا اور آخرت کے متعلق مسلمان کا یہ ذہنی اور قلبی احساس ہی اس کی ساری پونجی ہے۔ مگر اشتراکیت مسلمان کی اس اساس کو تباہ و برباد کر دینے کے درپے ہے قرآن کہتا ہے کہ خدا روف بالعباد (اپنے بندوں پر رحمدل) ہے اشتراکیت کہتی ہے کہ وہ (خاکم بدہن) بدترین ظالم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میری دعوت یکسر دلیل و برُہان پر مبنی ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲-۱۰۸)۔

کہہ دیجئے کہ میں اور میرے متبعین خدا کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں۔

اشتراکیت کہتی ہے کہ مذہب افیون کی گولی ہے جو قوائے ذہنی کو سلب کر لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حُدُوْدُ اللّٰہ کی پابندی میں ہی دین و دنیا کی فلاح و کامیابی ہے۔

"بالتحقیق فلاح و بہبودی صرف ان مومنین کے لئے ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے

والے ہیں جو لغویات سے برکنار رہنے والے ہیں۔ جو اعمال و افعال میں اپنا تزکیہ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو حرام شہوت رانی سے بچائے رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲۳-۵-۱)

اشتراکیت کہتی ہے تمام حدود و قیود کا توڑنا ہی اصل انسانیت اور فلاح و بہبودی کا راز ہے۔ قرآن جہاں اِس دنیا میں عزت و کامیابی حاصل کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ وہاں وہ اس حقیقتِ کبریٰ کو بھی فراموش نہیں ہونے دیتا کہ دنیاوی زندگی حقیقی انسانی زندگی کی ایک تخمی شکل ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ (۲۹-۶۴) ۔

اور یہ دنیاوی زندگی (بایں ہمہ اہمیت) محض کھیل کود کی زندگی ہے اصلی زندگی تو دارالآخرۃ کی ہے ۔

لیکن اشتراکیت کہتی ہے کہ اصل زندگی دنیوی زندگی ہے اس کے بعد کی زندگی کا خیال لغو و مہمل ہے۔ مذہب اور امور دنیا (مثل سیاست و اقتصادیات معاشرت و معیشت) کسی اور مذہب میں جُدا جُدا ہوں تو ہوں لیکن اسلام دین و دنیا کو الگ نہیں کرتا۔ اس نے جہاں روحانی اور اخلاقی زندگی کا ایک دستورالعمل پیش کیا ہے وہاں تمدنی اور معاشرتی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا مکمل ضابطہ بھی مسلمانوں کو دیا ہے۔ اور یہی چیز تکمیل دین اور اتمامِ نعمت ہے (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ) مسلمان کے لئے رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ، اے اللہ مجھے دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور عاقبت میں بھی کی دعا تجویز کی گئی ہے۔ غرض اصل اور فرع دونوں میں اشتراکیت قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ اور جب کوئی اس تحریک کی تائید کرے گا قرآن کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اشتراکین کا مذہب کے خلاف جنون ردعمل کا نتیجہ ہے اور انہیں امید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اعتدال پر آجائیں گے۔ لیکن واقعات اس خوش فہمی کی تکذیب کرتے ہیں۔ ۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو بالشویکوں نے مذہب اور آزادیٔ ضمیر کے متعلق جو منشور جاری کیا تھا اُس میں مذہب و ملت کو حکومت سے علیحدہ کیا گیا تھا اور یہ اجازت دی تھی کہ۔

(۳) کوئی شہری جونسا مذہب جی چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

اور اگرچہ مدارس و مکاتب میں مذہبی تعلیم کے مظاہرے ممنوع قرار دیئے گئے تھے لیکن اس کی اجازت تھی کہ۔

(۹) ہر شہری نجی طور پر اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلا سکتا ہے۔

(Religion under the Soveit)

اس میں مذہبی عبادتگاہوں سے تعرض نہیں کیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۲ء (فروری) میں حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مذہبی عبادت گاہوں کی جائداد و املاک ضبط کر لی جائیں۔

(Russia Reported—1921-1923)

۱۹۲۷-۲۸ء میں یہ تشدد اور بھی بڑھ گیا۔ اور عبادتگاہیں مسمار کر دی گئیں۔ مذہبی مکاتب جبراً بند کر دیئے گئے مذہبی تعلیم ممنوع قرار دیدی گئی۔ مناسک و عبادات کی ادائیگی روک دی گئی اور خدا کے پرستاروں کے لئے خدا کا نام لینا جرم عظیم قرار دیدیا گیا۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جوں جوں یہ تحریک زیادہ مستحکم ہوئی۔ مذہب کے خلاف اس کا جذبۂ انتقام و عناد زیادہ مشتعل ہوتا گیا۔ لہٰذا یہ امید کہ قوت کے استحکام کے بعد اشتراکین میں میانہ روی آجائے گی۔ اپنے آپ کو دھوکہ دینا اور حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ لیکن بفرض محال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وحشت و بہیمیت کے بعد اشتراکین میں اعتدال آجائے گا تو جب وہ کچھ مسلمانوں کو مرتد اور باقی کو جور و ستم کا شکار بنا کر شہید کر چکے ہوں گے تو اس وقت جبکہ (کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی) اگر اُن کا مزاج اعتدال پر آیا بھی تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکین کی دہریت اُن کے نزدیک خود ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے منکرینِ خدا کی انجمنیں قائم ہیں انہیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی ہے اور لامذہبیت کی اشاعت کے لئے پوری آزادی حاصل ہے

(Religion under the Soveit)

طریقِ کار اشتراکیت کی نشر و اشاعت کے لئے جو لائحۂ عمل یا طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے اُس میں ہر قسم کا فتنہ و فساد، آگ اور خون، مسلح انقلاب، جور و استبداد، جبر و استکراہ سب کچھ شامل ہے۔ اشتراکین کے نزدیک جائز وہ ہے جس سے مطلب براری ہو۔ اور ناجائز وہ ہے جو اُن کے مقاصد کے منافی ہو اسلام اِس طریقِ کار کا حامی نہیں۔

کسی نظام میں تغیر پیدا کرنے کے لئے دو قسم کے طریقۂ عمل اختیار کئے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خرابیوں کے اسباب و علل پر ٹھنڈے دِل سے غور کیا جائے۔ حالات کا جائزہ لیا جائے۔ مخالفین کے خلاف دِل میں انتقامی جذبہ پیدا نہ ہو۔ نقائص و اسقام کے دور کرنے کے لئے نرم روی سے علاج سوچے جائیں۔ دعویٰ کے اثبات میں دلائل و براہین پیش کرنے سے فریقِ مخالف کا سکوت نہیں بلکہ سکون مقصود ہو۔ جب تک اپنی حفاظت اور مظلوموں کی حمایت کے لئے مدافعت کی ضرورت نہ پڑے طاقت و قوّت کا استعمال نہ کیا جائے۔ اگر سوسائیٹی کی صحت و بقا خطرہ میں پڑ جائے تو (اُس کے جسم کا) صرف اتنا حصّہ، کاٹا جائے جو زہر آلود ہو کر لاعلاج ہو چکا ہو۔ اس طریقِ عمل کا نام قرآن کریم نے اصلاح رکھا ہے۔

دوسرا طرزِ عمل وہ ہے جس کی ابتدا غیظ و غضب اور جوشِ انتقام سے ہوتی ہے۔ اس میں ہر قسم کی تخریبی قوت بروئے کار لائی جاتی ہے۔ فریقِ مخالف کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوتا۔ ہر نظریئے کو زبردستی منوایا جاتا ہے۔ بدعنوانیوں کا استیصال ویسی ہی بدعنوانیوں سے کیا جاتا ہے۔ اِس جوش و خروش، اِس شورش و اضطراب کا نام جسے آنجہانی انقلاب کہا جاتا ہے قرآن کی اصطلاح میں فساد ہے۔ اسلام اِس قوّت آزمائی، اِس ہنگامہ آرائی، اِس جبر و اکراہ، اِس ظلم و استبداد کا یکسر مخالف ہے۔ قرآن کریم نے اس طریقہ کا ضمناً اِس انداز میں ذکر فرمایا ہے:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ۔ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝ (۲:۱۱-۱۴)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے فساد مت کرو زمین میں۔ تو کہتے ہیں کہ (نہیں) ہم تو محض اصلاح کرنیوالے ہیں۔ بیشک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اسے سمجھتے نہیں

اسلام کا طریقِ کار اصلاح ہے۔ فساد نہیں۔ چنانچہ حضرات انبیاءؑ نے تغیرِ حالات کے لئے اصلاح ہی کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مثلاً حضرت شعیبؑ کے ذکر میں ہے:۔

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۱۱/۸۸

میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے خلاف وہ طریق عمل اختیار کروں جس سے میں خود منع کرتا ہوں۔ میں تو جہاں تک میرے امکان میں ہے صرف اصلاح چاہتا ہوں۔

اپنی نشر و اشاعت کے لئے اسلام نرم روی اور رواداری سے کام لیتا ہے۔ اور جبر و اکراہ کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ فرمایا:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (۲ : ۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی جائز نہیں (اسلئے کہ) ہدایت و گمراہی بالکل ایکدوسرے سے الگ ہو چکی ہے

جس کا جی چاہے ایمان اختیار کرے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے (فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ) اسلام نے جہاں جسمانی جبر و اکراہ کو معیوب قرار دیا ہے وہاں عقل و شعور کے مقابلہ میں ذہنی استکراہ کو بھی جائز نہیں رکھا۔ اس نے اپنی دعوت کے لئے اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود سکونِ قلب ہے نہ اسکاتِ خصم۔ علمِ منطق کی رو سے استدلال کے بالعموم تین طریقے قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک برہانیات جس میں یقینی شواہد کے ذریعہ دعوے کے اثبات میں دلائل لائے جاتے ہیں۔ دوسرے خطابیات جسمیں مؤثر طریقِ خطابت سے مافی الضمیر کو دوسرے کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ اور تیسرے جدلیات یعنی ایسے اقوال سے دعوے کو ثابت کیا جاتا ہے جو فریقین میں مسلّم ہوں۔ قرآن کریم نے یہی تینوں طریقے اپنی دعوت کے لئے تجویز فرمائے ہیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ (۱۶ : ۱۲۵)

لوگوں کو اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت و دانائی اور موعظۂ حسنہ کے ذریعے بلاؤ۔ اور ان سے مناظرہ نہایت عمدہ طریق سے کرو۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ جب فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لئے مامور ہوئے تو ان سے ارشاد ہوا کہ۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۲۰ : ۴۳، ۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے طوفان برپا کر رکھا ہے لیکن اس سے نرمی سے بات کرنا۔ شاید وہ نصیحت قبول

کرلے یا (اللہ سے) ڈرے۔

نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا کہ تبلیغِ حق کے لئے

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (النساء)

اُن سے ایسی باتیں کہئے کہ سیدھی ان کے دِل میں اُتر جائیں

اِس میں شبہ نہیں کہ اسلام کو لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں۔ لیکن اُن کا مقصد کسی قوم کی آزادی کو سلب کرنا نہیں تھا[1] بلکہ ہر ایک مذہب کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا۔ فرمایا:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲/۴۰)

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے گرجا۔ یہودیوں کے معبد۔ ترساؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مساجد جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے منہدم ہو گئے ہوتے۔

مذکورہ بالا صورت کے علاوہ قتل و خونریزی کو قرآنِ کریم نے فعل شنیع قرار دیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا:۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۵/۳۲

قتلِ بے گناہ یا فساد فی الارض کی نوعیت سے جس نے ایک جان کو بھی مار دیا۔ یوں سمجھئے کہ گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک انسان کو مرنے سے بچایا اُس نے گویا کل بنی نوع انسان کو زندگی بخشی۔

امن پسند انسانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالنا۔ جذبۂ وحشت و غارت گری فرو کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہا دینا۔ انتقام لینے کے لئے ہنستے انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دینا۔ اسلام کے

---

[1] سر طامس آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب (Preaching of Islam) میں مختلف اقوام و ممالک میں تبلیغ اسلام کی تاریخ شرح و بسط سے لکھ کر ثابت کیا ہے کہ اسلام کہیں بھی بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا گیا۔ منہ

نزدیک حرام ہے۔ اسلام کا مادہ سلم ہے جس کے معنی امن وسلامتی کے ہیں۔ اسلام کو فساد و غارتگری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ کسی شکل میں بھی حق وصداقت اور عدل وانصاف کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک جو چیز ناجائز وحرام ہے وہ دوست دشمن سب کے لئے ناجائز و حرام ہے۔ فرمایا:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵:۸)

(دیکھنا) کسی قوم کی دشمنی کہیں تمہارے لئے اس بات کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ (ہمیشہ) عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

تاریخ وسیر میں اس امر کے شواہد بکثرت ملتے ہیں کہ مسلمان اور غیر مسلم کے تنازعہ میں مسلمان قاضی کی عدالت کی ڈگری غیر مسلم کو ملی۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف جھگڑوں میں اپنے ججوں کو چھوڑ کر نبی اکرمؐ کو ثالث مقرر کیا۔

میدانِ جنگ میں دنیا بھر کے مقننین قوت کے ہر قسم کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن نبی اکرم جب کسی دستۂ فوج کو روانہ فرماتے تھے تو التزاماً انھیں تاکید فرماتے تھے کہ

"خبردار اگر کسی نے غیر مذہب والے پر ظلم کیا یا اس کے مذہب کی تنقیص کی یا کوئی چیز بجبر اس سے چھین لی تو یاد رکھو قیامت کے دن خدا کے حضور اس کی طرف سے ایسا کرنے والے مسلمان کے خلاف میں جھگڑوں گا۔" (ابوداؤد۔ جلد دوم)

ان حقائق کی روشنی میں کون کہہ سکتا ہے کہ اشتراکیت کا طریق عمل اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ ظلم واستبداد۔ جور وتعدی۔ خون آشامی۔ آتش ریزی۔ فتنہ وفساد اور قتل وغارت کی استھلاک انگیز و امن شکن تحریک اسلام کے نزدیک کیسے مستحسن ہو سکتی ہے جس کا مقصد وحید ہی دنیا سے اس قسم کے وحشیانہ جرائم کا نیست ونابود کرنا ہے!

نتائج:۔ اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ

اشتراکیت نے دنیا کی مسرتوں اور راحتوں میں کس قدر اضافہ کیا ہے اور نظامِ انسانیت عالم میں کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔ روس کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ روس ہی فی الحقیقت اشتراکیت کا گہوارہ ہے۔

اشتراکیت کے علمبرداروں کے نزدیک دنیا کی تمام تباہیاں اور بربادیاں۔ تمام ہلاکتیں اور مصیبتیں اقتصادی نظام ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ہیں اور ان کا واحد علاج تحریکِ اشتراکیت ہے۔ ۱۹۱۸-۱۹ء میں زارِ روس کے نظامِ حکومت کا تختہ الٹ کر اس تحریک نے زور پکڑا۔ ابھی ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں روس میں ایک قیامت خیز قحط پڑا۔ جس کے رفع کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے استعمال کیے گئے۔ جائدادیں غصب کی گئیں۔ سرمائے چھین لئے گئے۔ فقیر کی جھونپڑی سے لیکر امیر کے محلات تک میں جو کچھ مال و اسباب کچھ ضبط کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ تختہ ہائے مسجد جو قابلِ سوختن نہ قابلِ فروخت سمجھے جاتے تھے انھیں بھی حکومت نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ لیکن حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ماہرینِ زراعت کے نزدیک قحط کی اصلی وجہ اشتراکیت کی پہلی اسکیم ملکیت (Requisition Scheme) تھی۔ یہ دیکھکر کہ پیداوار اوروں کی ملکیت ہو جاتی ہے کسانوں نے زمین میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور خود لینن کو کہنا پڑا کہ یا تو ذاتی تجارت کی پھر اجازت دینی پڑے گی یا کسانوں کے خلاف جدال و قتال کرنا ہوگا۔ چنانچہ ملکیت کی اسکیم کو چھوڑ کر اجتماعی طریقِ زراعت (Collective Scheme) جاری کیا گیا۔ مگر یہ بھی ناکام رہا۔ اس اسکیم میں فوج کے سپاہی کسانوں کی فصل اٹھا کر حکومت کے مرکزوں میں جمع کرتے تھے۔ اور جو کوئی ان کی مزاحمت کرتا تھا اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ اس تشدد کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کسان زمین چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور زمینیں سبزہ بیگانہ سے اَٹ گئیں (ملاحظہ ہو (Bombay Sentinal)

چنانچہ ایک امریکن سیاح مسٹر (Sherwood Eddy) جو عام طور پر روسی طرزِ حکومت کا مداح ہے پچیس سالہ سیاحت کے خیالات قلمبند کرتے ہوئے اپنی کتاب (Russia to-day) میں لکھتا ہے کہ کسانوں کو حکومت کی طرف سے نادر شاہی احکام ملتے ہیں کہ اس قدر غلہ فی کھیت پیدا کرنا ہوگا۔ اگر آفاتِ ارضی و سماوی کی وجہ سے کسان غلہ کی اتنی مقدار بہم نہ پہنچا سکے تو اُسے سائبیریا کے یخ بستہ

میدانوں کی طرف جلاوطن کر دیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو Daily Gazette Karachi)

اس میں شبہ نہیں کہ ان ایام میں ساری دنیا اقتصادی کساد بازاری کے بے پناہ عذاب میں مأخوذ تھی۔ خود ہندوستان میں اجناس کا نرخ اتنا گر گیا تھا کہ اس کی نظیر گذشتہ صدی میں ملنی مشکل ہے۔ لیکن بایں ہمہ اگر غلہ کا قحط کہیں دنیا کے کسی حصہ میں پڑا تو وہ صرف روس کا ملک ہے جو دنیا بھر میں گندم کی پیداوار کا بہترین خطہ سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں وہاں دوبارہ قحط پڑا جس میں دیہات والوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بلی۔ کتے حتیٰ کہ انسانوں تک کو کھا گئے۔ مگر تعزیری پولیس فصل جمع کرنے کے کام میں بدستور مشغول تھی۔ آذربائیجان کے علاقہ میں قحط اپنی انتہائی شدت پر تھا۔ فروری سے اکتوبر ۱۹۳۲ء تک قریب ۳۰۰۰۰ نفوس اس علاقہ سے خراسان کی طرف ہجرت کر گئے۔ مسٹر (Williams) نے اپنی سیاحت کی بنا پر جن حالات کا انکشاف کیا ہے وہ عبرت و بصیرت کی داستان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ہزارہا کھیت ایسے دیکھے گئے جن میں فصل پڑی سڑ رہی تھی۔ کیونکہ بہت سے کسان بھوک کی شدت سے زمین چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ جو باقی تھے وہ خود بھوکے مر رہے تھے۔ کیونکہ تمام غلہ پہلے حکومت کے مرکزوں میں جمع ہوتا تھا اور پھر وہاں سے کسانوں کا حصہ ملتا تھا (ملاحظہ ہو (Bombay Sentinal) مجریہ ۱۳ مارچ ۱۹۳۴ء) ایک کسان نے کانگریس کے بھرے اجلاس میں کہہ دیا تھا کہ "زمینیں ہماری ہیں لیکن فصل تمھاری۔ چراگاہیں ہماری ہیں لیکن گھاس تمھاری۔ جنگل ہمارے ہیں لیکن درخت تمھارے۔" تشدد پسند انقلاب کی بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر خرابی کا علاج تشدد سے کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مضمون ہو جاتا ہے۔ اس کے حامی مرض کے اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کرتے۔ انھیں ہر بات پر غصہ آجاتا ہے اور ان کا ہر علاج انتقامی جذبہ میں شرابور ہوتا ہے اشتراکیت کا انقلاب تشدد کا انقلاب ہے۔ چنانچہ نسل کشی اسپان کے ۳۸ ڈکٹیٹروں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اسپان کی نگہ پرداخت میں تساہل برتا ہے۔ اس تساہل کے لئے ۱۱ کو سزائے موت۔ ۹ کو دس دس سال کی قید اور باقیوں کو اور سزائیں دی گئیں۔ (اسٹیٹسمین مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۳۴ء)

روس کے ایک اخبار کی رپورٹ کے مطابق مارچ ۱۹۳۴ء میں ایک شخص کو غلہ چرانے کے جرم میں

سزائے موت کا فتویٰ سنا دیا گیا۔ چنانچہ خود لینن نے اس بدنظمی سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ ہمیں شک نہیں کہ ہم بے آئینی کے ایک بحر ذخار میں بہے چلے جا رہے ہیں اور مقامی اثرات سخت درجہ مانع ہیں کہ ملک میں نظام امنیت قائم ہو سکے (Communism Exposed)

حکومت کے اقتدار۔ اشتراکیت کے تسلط اور استیلائے بہیمی کے استحکام کے لئے جس قدر ظلم و تشدد اور قتل و غارت روا رکھا گیا ہے نظام و آئین کے تحفظ کے لئے جس قدر بے آئینی و بے نظمی برتی گئی ہے۔ قانون کے ضبط و انضباط کے لئے عدل و انصاف کے اندھے دیوتا کے مندر پر جس قدر قربانیاں چڑھائی گئی ہیں اور اپنے اعتقادات کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر خون کی سیلاب انگیزیاں برپا کی گئی ہیں اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکیگا جو مسٹر جون وائن ہرڈ (John Wynne Hind) نے اپنے تیس سالہ قیام روس کے زمانہ میں فراہم کئے تھے اور جو ڈیلی گزٹ کراچی کی اشاعت مورخہ ۵ و ۶ جون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے تھے۔

تعداد مقتولین

اساقیف	۳۱
پوادر	۱۵۶۰
جج وکلاء اور مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵
اساتذہ اور طلباء	۱۶۳۶۷
سول حکام	۷۹۹۰۰
امراء و روساء	۶۵۸۹۰
فوجی افسر	۵۶۳۴۰
مزدور مرد و عورت	۱۹۶۰۰۰۰
سپاہی اور جہازراں	۲۶۸۰۰۰۰
کسان اور کاشتکار	۸۹۰۰۰۰۰

بخت نصر کی تباہ کاریاں۔ یونانیوں کی ستم ریزیاں۔ ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں۔ رومیوں کی ہلاکت آفرینیاں۔ حتیٰ کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی قتل و غارتگری کی خونچکاں اور خونفشاں قیامت خیزیاں سب اس فہرست کے سامنے شرمندہ ہیں۔ یہ نتائج اس اشتراکیت کے ہیں جس کے متعلق خود لینن کا دعویٰ تھا کہ یہ تحریک حکومت اور جنگ کی دہشتوں سے نجات دلانے کی صراطِ مستقیم ہے۔

(Dialectical Materialism

by V-Adoratsky)

اور جس کے متعلق حوالۂ بالا کتاب کے مؤلف کا بیان ہے (جو آجکل ماسکو میں مارکس۔ انجلز۔ لینن انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر ہے) کہ:-

نسلِ انسانی صرف قوتِ بازو سے جو اشتراکیت کی شکل میں موجود ہے۔ نیم بربریت کی زندگی اور افلاس۔ استبداد اور جہالت کے پنجہ سے رہائی پا سکتی ہے نہ کہ خدا کی مدد کے بھروسہ پر۔ جس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔" (ایضاً ص۳۱۱)

یہ ہے وہ روس جس کے متعلق ہمارے ہندوستانی سوشلسٹ جناب منتظر صاحب کا بیان ہے کہ

"اسی ردِّ عمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے جو زمین پر ایک جنت ہے۔

وہاں بے روزگاری۔ بھوک۔ جہالت اور تنگدستی کا نام نہیں" (مدینہ ۱۲/۱۳ ۱۳)

اس کے مقابلہ میں خدا کی مدد پر بھروسہ رکھنے والے اسلام نے جو نتائج پیدا کئے اُن کے متعلق مسٹر (A. Von Kremer) "جو ایک ممتاز مستشرق ہیں، لکھتے ہیں کہ:-

"اصلاح کا یہ عظیم الشان کام برابر سرانجام پاتا رہا۔ حتیٰ کہ جب محمد (صلعم) کی وفات ہوئی تو عرب کے بیشتر حصہ پر خدا کی امنیت و سکینت کے ایسے بادل چھا رہے تھے جو قتل و غارتگری کے خوگر۔ عربوں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے تھے۔ امن و سلامتی کا یہ دَور دَورہ محض اسلام کے طفیل سے تھا۔"

(Preaching of Islam)

فتنہ و فساد کے استیصال اور امن و سلامتی کے تسلط کے لئے اسلام کو بھی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ نبی اکرم کی دس سالہ مدنی زندگی میں کم و بیش ۸۰ لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں مسلمانوں کے ۲۵۹ اور مخالفین کے ۷۵۹ آدمی قتل ہوئے۔ یعنی کل ۱۰۱۸ گویا مقتولین کی اوسط فی لڑائی ۱۳ ہوئی۔ ان ۸۰ جنگوں میں قیدیوں کی اوسط فی لڑائی سات ہے۔ قیدیوں کے ساتھ سلوک کے متعلق جنگِ بدر کے ایک قیدی عزیز کا بیان ہے کہ میں حضرت مصعب ابن عمیرؓ کے سپرد کیا گیا۔ حضرت مصعب دن بھر محنت مشقت کرتے اور شام کو گیہوں کی روٹیاں مجھے کھلاتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کرتے۔ میری گردن ندامت سے جھک جاتی اور جب میں کہتا کہ آپ روٹی کیوں نہیں کھاتے تو فرماتے کہ بھائی تم ہمارے مہمان ہو اور مہمان کی مدارات ہم پر فرض ہے

بصائر و عبر :- دنیا نے آج جس قدر مادیات میں ترقی کی ہے اس کی مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی کہیں ملے۔ میدانوں۔ پہاڑوں۔ خشکی۔ تری۔ غرض تحت الثری سے اوج ثریا تک ہر جگہ انسان کو اقتدار حاصل ہے لیکن بایں ہمہ غلبہ و استیلاء جس اضطراب و بیتابی کے دور سے دنیا آج گذر رہی ہے اس کی نظیر بھی تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملے گی۔ حریر و اطلس کے نرم و نازک لباس میں لپٹے ہوئے جسم کے اندر قلبِ انسانی کو دیکھئے تو عدمِ اطمینان اور فقدانِ سکون کی ایک آگ شعلہ فگن رہتی ہے۔ بڑے بڑے مدبرین جلیل القدر مفکرین سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں کہ ہلاکت و تباہی کی ان مہیب غاروں سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ مختلف فارمولے اور متعدد آزمز تجویز کئے جاتے ہیں لیکن

؎ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔ ایک اسکیم پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب راہِ نجات مل گئی۔ لیکن جلدی گھٹاٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس میں بھٹکنے لگ جاتے ہیں۔ تنہا عقلِ انسانی کی اس بے بسی کی مثال قرآنی الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ بجلی کی سی چمک ہے۔ جب چمکتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض سے لے کر عالمِ افلاک تک سب کچھ منور ہو گیا كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ (بقرہ) جب ان کا

گرد و پیش روشن ہو جاتا ہے تو چلنے لگتے ہیں۔ اور جب چمک ختم ہو جاتی ہے تو حیران و ششدر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا۔ اقوامِ عالم کی یہ حالت تو اس لئے ہے کہ ان کے پاس کوئی مستقل شمعِ ہدایت نہیں لیکن حیرت ہے مسلمانوں پر کہ جن کے پاس وہ نورِ مبین اور شمعِ ہدایت موجود ہے جو لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے والی ہے (لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ) لیکن افسوس انھوں نے اس شمعِ ہدایت کو چراغِ تہِ دامن کی طرح غلافوں میں لپیٹ کر زینتِ دہ طاقِ نسیان بنا رکھا ہے اور دوسروں کے جگنو کی روشنی کو خضرِ راہ سمجھ کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کہیں اشتمالیت کہیں فسطائیت کہیں نازی ازم۔ کہیں کمیونزم۔ غرضیکہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں،

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کے دائیں بائیں دو تہذیبیں موجود تھیں۔ ایک طرف رومیوں کی تہذیب اوجِ کمال پر تھی۔ دوسری طرف ایرانیوں کے تمدن کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اگر اسلام اپنے ساتھ کوئی مستقل تہذیب نہ لایا ہوتا اور فلاح و بہبود دوسروں ہی کی تقلید میں ہوتی تو انھیں حکم دیدیا جاتا کہ رومیوں یا ایرانیوں کی تہذیب اختیار کر لو۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ کہا گیا کہ :-

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (النساء)

اے مسلمانوں۔ تم ایمان رکھو اللہ پر اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی۔

یعنی کتابِ مبین کی روشنی میں جو اللہ کا نور ہے رسول اللہ کے نقوشِ قدم پر چلے جاؤ۔ تہذیب اسلامی کے ان عناصرِ ترکیبی پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم قیصر و کسریٰ کی تہذیبوں کی مالک بن گئی۔ یہ احسانیات

یونان کے افسانے نہیں بلکہ تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں ہیں۔ ایک انگریز مورخ کے بیان کے مطابق عہدِ فاروقی تک یعنی بارہ سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر لئے تھے۔ جس کی اوسط ۹ قلعے روزانہ پڑتی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسلام کا انقلاب اشتراکیت کا انقلاب نہ تھا۔ جس میں خونِ ناحق کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام کی فتح اس انداز کی تھی کہ جیسا حمص کا شہر فتح ہوا تو اُس کی حفاظت کے لئے شہر والوں سے سال بھر کا زرِ جزیہ لیا گیا۔ لیکن چونکہ چھ ہی مہینے کے بعد مسلمان فوجوں کو کسی اور جگہ منتقل ہونا پڑا خلیفۃ المسلمین نے حکم بھیجدیا کہ نصف زرِ جزیہ اہلِ شہر کو واپس دیدیا جائے کیونکہ جب ہم ان کی حفاظت ہی نہ کرینگے تو زرِ معاوضہ کیسا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور جب مسلمان رخصت ہونے لگے تو اہلِ شہر کا جو عیسائی تھے یہ حال تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ مسلمانوں سے کہتے جاتے تھے کہ خدا کے لئے جلد واپس آنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں پھر رومیوں کے ماتحت رہنا پڑے۔ حالانکہ رومی اُن کے ہم مذہب تھے۔

نتائج مارکس اور لینن کی اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کی اتباع سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ راستہ آپ کو منشورِ اشتراکیت سے نہیں بلکہ اس احکم الحاکمین کے ضابطۂ ازلی کی مدد سے ملیگا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کے تابع فرمان ہو جائینگے تو صدرِ اسلام کی تمام نعمتیں حاصل ہو جائینگی۔ کیونکہ خدا کی طرح جو حیٌّ لا یموت ہے اس کی کتاب بھی زندۂ جاوید۔ لیکن اگر آپ کفر و اسلام۔ حق و باطل۔ اہرمن و یزدان۔ خدا و شیطان۔ قرآن و اشتراکیت کو بیک وقت دل میں جگہ دینگے۔ اگر خدا کو خدا مانتے ہوئے دوسروں کے آستان پر جبہ سائی کرینگے۔ اگر اُس کے نورِ مبین کی موجودگی میں دوسروں کی نظرِ فریب ضیا پاشیوں کو مشعلِ ہدایت بنائینگے تو یاد رکھئے قرآن کا یہ اٹل فیصلہ آپ کے لئے موجود ہے۔ کہ

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۔ ۳۱/۲۲

جس نے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا۔ یا کوئی پرندہ اُسے اُچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا تھپیڑا اُسے اُڑا کر کسی دور دراز مقام میں لے گرا (یعنی اس کا کوئی مرکز نہ رہا)

لیکن اگر آپ گلشنِ کائنات میں سرفرازی و بردمندی چاہتے ہیں تو اس کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ مذہب و شریعت کی ارضِ مقدس میں آپ اپنی جڑوں کو مضبوطی سے پیوست کریں كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ

اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوں۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم درکش
پریدہ رنگ زبادِ صبا چہ میجوئی (اقبال)

لیکن اگر کسی تحریکِ ارضی کی جاذبیت آپ کو اپنی طرف اس لئے کھینچ رہی ہے کہ اس میں عیش و نشاط کی فراوانیاں مضمر ہیں تو یاد رکھئے خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۲۸/۵۸

ہم بہت سی بستیاں ایسی ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامانِ عیش و طرب پر نازاں تھیں، سو دیکھ لو یہ اُن کے گھر بار ہیں کہ پھر اُن کے بعد یہ آباد نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے اور آخر کار ان سب سامانوں کے ہم ہی وارث ٹھہرے۔

برادران! یہ ہے سوشلزم اور اس کے مقابلہ میں یہ ہے اسلام! آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ سوشلزم کو اسلام سے کتنا تعلق ہے لیکن غور طلب معاملہ یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کانگریس کا نصب العین یہ ہے کہ ملک کو سوشلزم کے لئے تیار کیا جائے۔ اور جب اختیارات اپنے ہاتھ میں

آجائیں تو یہاں سوشلزم کے انداز کی حکومت قائم کر دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے علمائے کرام کا یہ فتویٰ ہے اور بار بار فتویٰ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ بلا شرط جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جائیں یعنی عملاً نظامِ سوشلزم کے قیام میں معاونت کریں۔ آپ ان سے کبھی دریافت تو کیجئے کہ وہ نظام سوشلزم جو اسلام کی ضد ہے اس کا عملی قیام کس طرح اسلامی فریضہ قرار پا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات ایک طرف سوشلزم کو اسلام کی نقیض بھی قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اُن کی حالت یہ ہے کہ خود جمعیت العلماء کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ صاحب انصاری اپنے خطبۂ صدارت میں سوشلزم کو تمام مصائب کا واحد علاج قرار دیتے ہیں اور ہمارے علماء حضرات میں سے کسی ایک کی طرف سے ایک لفظ بھی مخالفت کا نہیں کہا جاتا۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد ترجمان القرآن (جلد دوم) میں سوشلزم اور قرآنی تعلیم میں اصولی فرق بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کانگریس کے سرگرم کارکن بھی ہیں جس کا نصب العین سوشلزم نظامِ حکومت کا قیام ہے۔ اپنے مسلک کے جواز میں ان حضرات کے پاس لے دے کے دلیل صرف ایک ہے کہ انگریز کو ملک سے نکال دو۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ کون سا مرد مسلمان ہے جس کے ہاتھ میں قرآن ہو اور وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی انگریز کی غلامی پر قانع رہ سکے۔ لیکن سوال صرف انگریز کو نکال دینا ہی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بعد ہندوستان کا نظامِ حکومت کیا ہو۔ اور چونکہ جدید نظامِ حکومت کی بساط بھی ساتھ ہی ساتھ بچھتی چلی جا رہی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس امر کا فیصلہ بھی اسی وقت کر لیا جائے کانگریسی مسلک کی مساعی کا مقصد یہ ہے کہ جب اختیارات مل جائیں تو نظامِ حکومت سوشلزم ہو لیکن ایک صحیح مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ جب آزادی مل جائے تو ملک کا نظامِ حکومت اسلامی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ متحدہ قومیت کے نظر فریب سراب کو چھوڑ کر تمام مسلمان اپنی الگ جماعتی تشکیل کریں اور اپنا نصب العین قرار دیں ملک میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام۔ وذٰلک دین القیمۃ

ایک مسلمان